لکھنؤ کے سب سے بے مثل سخنور اردو کے لاثانی زبان آور

میر انیس اعلی اللہ مقامہ کا تذکرہ موسوم بہ

حیات انیس

تالیف

مولانا سید امجد علی صاحب اشہری

مطبع آگرہ اخبار آگرہ میں خواجہ صدیق حسین مہتمم

کے اہتمام سے چھپا

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

فردوسی اُردو میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کا تذکرہ موسوم بہ

حیاتِ انیس

اردو کی جان ہے فصاحت کی کان ہے ہر بند انتخاب ہر شعر لاجواب ہے
نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

تالیف مولانا سید امجد علی صاحب اشہری

مطبع آگرہ اخبار میں چھاپا گیا

شبیہ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ

فہرست مضامین

حیات انیس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رباعی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو

نزدیک رگ جاں سے ہے اُس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

زلافِ حمد و نعت او سے است بر خاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

اللھم صل علیٰ محمدٍ و آلِ محمدٍ۔

بنیادِ خیال

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے مشہور بانی سر سید احمد خان بہادر کا انتقال ہوا راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ جو سر سید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالی شان

ملے وہ مبدء فیاض سے انہیں مضموں
جو اہلبیت کے ہیں خاص لایق دربار

دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا
بڑے شکوہ سے دکھلائی ہیبتِ گفتار

مگر انیس کو فردوسی سخن پایا
دبیر مثل نظامی ہوئے مرصع نگار

انیس مہر سپہر کمال فن سخن
دبیر ماہ کمالِ سپہر عزو وقار

شعاعِ مہر کلام نفیس[1] سے پیدا
کلام اوج[2] شب مہ کی طرح پر انوار

بڑے بڑے علما اُن کے حامل معنی
بڑے بڑے ادبا اُن کے ناقل گفتار

بڑے بڑے فصحا انکے قایلِ بندش
بڑے بڑے بلغا اُنکے واصفِ اشعار

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے
کہ میں انیس کی لائف لکھوں بصد اصرار

مگر ہے اسکے لئے علم سے شئے ضرور مجھے
ہر ایک طرح کے حالات ہیں مجھے درکار

جو آپ مجھ کو مدد دیں تو ہوں میں لکھ سکتا
وگرنہ آپ کو جو سہل ہے مجھے دشوار

یہ نظم رسالہ مخزن لاہور میں طبع ہوکر اخباروں میں نقل ہوئی - اور اس خیال کی تائید اور نظم کی تعریف میں کئی خط آئے - زاں بعد میرے لڑکے "سید منظر علی جعفری" نے کئی اخباروں میں اس مقصد سے اشتہار دئے کہ جن صاحبوں کو جناب غفران مآب کے حالات معلوم ہوں وہ لکھ بھیجیں لیکن اس پر بھی بجز وعدہ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا - ایک صاحب یہی لکھتے رہے کہ اب ماہ مبارک رمضان ہے اس میں فرصت کہاں - اب محرم آگیا فرصت معلوم - اب چہلم آیا - اب نوروز کا زمانہ ہے اس لئے معذور ہوں - آئندہ فرصت ملی تو لکھونگا - یہاں تک کہ میں نے لاچار ہوکر خط لکھنا چھوڑ دیا -

مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ خود "موازنہ انیس و دبیر"

---

[1] میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم خلف میر انیس اعلی اللہ مقامہ -

[2] میرزا اوج سلمہ اللہ تعالی خلف میرزا دبیر نور اللہ مرقدہ -

سے لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔ ادھر میں نے میر انیس کے متعلق حالات جمع کرنے کا لگا لگا دیا تھا اور اُن کے اقتباس کلام کو متفرق اوراق پر لکھتا رہا جس سے کچھ مواد جمع ہوگیا۔ اس کا ذکر مولانا شبلی صاحب سیکرٹری صیغہ ترقی اُردو نے اپنی رپورٹ میں کردیا۔ پھر اُن کے بعد جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب سیکرٹری صیغہ ترقی اُردو رئیس بھیکن پور (علی گڑھ) نے بکرات و مرات اس کام کے پورا کر دینے کو لکھا اور آخر میں تحریر فرمایا کہ جو کچھ جمع ہوگیا ہے وہ شائع کر دیا جائے اور جو آیندہ معلوم ہو وہ دوسرے اڈیشن کے لئے رکھا جائے۔ مجھے یہ خیال ایک حد تک مناسب معلوم ہوا لیکن باطنی جذبات نے ایک آخری کوشش کو اس سے زیادہ مناسب جانا۔ اور میں اپنی ذات سے لکھنو آیا تاکہ میر انیس مرحوم کے ارباب خاندان و معتقدین سے کچھ سرمایہ حاصل کرسکوں یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ میر انیس مرحوم کے رشتہ داروں میں سے ایک صاحب میر انیس کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں جو دوسرے کو نہیں مل سکتے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

سوا اس کے باقیات الصالحات میں جو موجود ہیں وہ میر صاحب کے حالات زندگی پر ایک ایسا پردہ پڑا رہنا پسند فرماتے ہیں جو عام آنکھیں میر صاحب کو نہ دیکھ سکیں جب تک کہ وہ بطور حاجب کے اُس پردہ کو نہ اٹھائیں۔ یہاں تک کہ میر انیس کے جو مرثیے منشی نولکشور صاحب آنجہانی مالک مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے پانچ جلدوں میں چھپوا دیئے اُن کے سوا دوسرے مرثیے اور سلام و رباعیاں بھی اُس پردہ میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی نئی نئی صورتیں بدلنے کا موقع باقی رہے یا یہ کہ اُس کی عام شہرت سامعین کے دلوں سے اس کے رنگ جدت کو پھیکا نہ

کردے۔ اور الحق اُن کے لئے یہ خیال مفید اور ضروری ہے۔ اب رہے معتقدین اُن کی یہ کیفیت ہے کہ اُن کو میر صاحب کی تشریف آوری یا میر صاحب کی مجالس میں اپنی نمود و نمایش کا محض ہر طرح کے صرف و اظہار ارادات کا موقع دیتا تھا جو میر صاحب کے بعد صرف برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ وہ میر انیس کے نام سے اپنی شہرت کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اُن کو اپنی طرف سے میر انیس کی شہرت مقصود نہیں اس لئے مجکو یہاں آنے پر بھی بہت کم حالات دریافت ہوسے۔ تاہم اس مجموعہ میں جو کچھ لکھا گیا وہ اور جگہ نہ ملے گا۔ اسی طرح اقتباس کلام میں زیادہ تر شاعری اور ادب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ خیالات مذہبی کو موضوع کلام نہیں بنایا گیا تاکہ ہندو مسلمان سنی شیعہ اور انگریزی تعلیم یافتہ جو اُردو کو اپنی زبان جانتے ہیں فصیح اُردو کے شایق ہیں اس سے عام دلچسپی حاصل کریں۔

ربیع الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں یہ مجموعہ مرتب کیا گیا۔

راقم

سید امجد علی اشہری

———•◦•※•◦•———
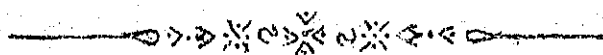
سب سے پہلے مرثیہ کہا گیا

قسمت کیا ہر چیز کو قسامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم ہم کو دیا سب میں جو مشکل نظر آیا

دنیا میں پہلے تاریکی پیدا ہوئی۔ پھر روشنی نے جلوہ دکھایا۔ مسلمانوں میں ہر سال کی تاریخ کا پہلا ورق غم سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخر میں یہ بارہ ورق کا روزنامچہ خوشی (عید ذوالحجہ) کے صفحے پر جا کر تمام ہو جاتا ہے۔ محرم غم کی بدایت اور ذوالحجہ خوشی کی نہایت کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی تاریخوں کے موافق دنیا کی پیدائش کا دیباچہ غم سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت آدم صفی اللہ کا جنت سے نکالا جانا بجائے خود افسانۂ غم اور پھر اُنکے ابتدائی آلام مزید براں نوحہ ماتم نظر آتے ہیں۔ شاعری میں سب سے پہلا شعر مرثیہ میں کہا گیا۔ یعنی حضرت آدم کے بیٹے ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرتِ آدم روئے اور اپنے مقتول بیٹے کے صدمۂ فراق میں جو نوحہ کیا وہ موزوں شعر بن گیا۔ پس اقسامِ شعر میں مرثیہ کو تین طرح کی بزرگی حاصل ہے۔

(۱) اول یہ کہ شاعری میں سب سے پہلے مرثیہ کو موزونیت کا لباس مرحمت ہوا۔
(۲) دوسرے وہ تمام دنیا کے سب سے پہلے آدمی کی زبان سے نکلا۔
(۳) تیسرے اُس کو ایک پیغمبر کی زبان سے نکلنے کا فخر حاصل ہوا۔

جیسے ہی مہینوں میں محرم اول ہے
ہے مرثیہ اقسامِ ادب سے پہلے

دنیا میں جو نظم فن کی بنیاد پڑی
آدم نے کہا مرثیہ سب سے پہلے

لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

میر انیس کا شجرہ

یارب ہمارا نہالِ تمنا ہرا رہے
یہ نخلِ باغِ دہر میں پھولا پھلا رہے

میر علی محمد صاحب عارف

دولھا صاحب ۱ | دختر ۲ | میر جلیس | پیارے صاحب رشید

میر نفیس ۱ | میر رئیس ۲ | میر سلیس ۳ | دختر ۴ | دختر ۵

میر نواب مونس ۱ | میر ببر علی۔ انیس ۲ | میر انس ۳

میر حسن خلق ۱ | میر مستحسن خلیق ۲ | میر محسن محسن ۳

میر غلام حسین حسن

میر عزیز اللہ | میر غلام حسین صاحب ضاحک | میر برات اللہ

میر امامی موسوی ہراتی
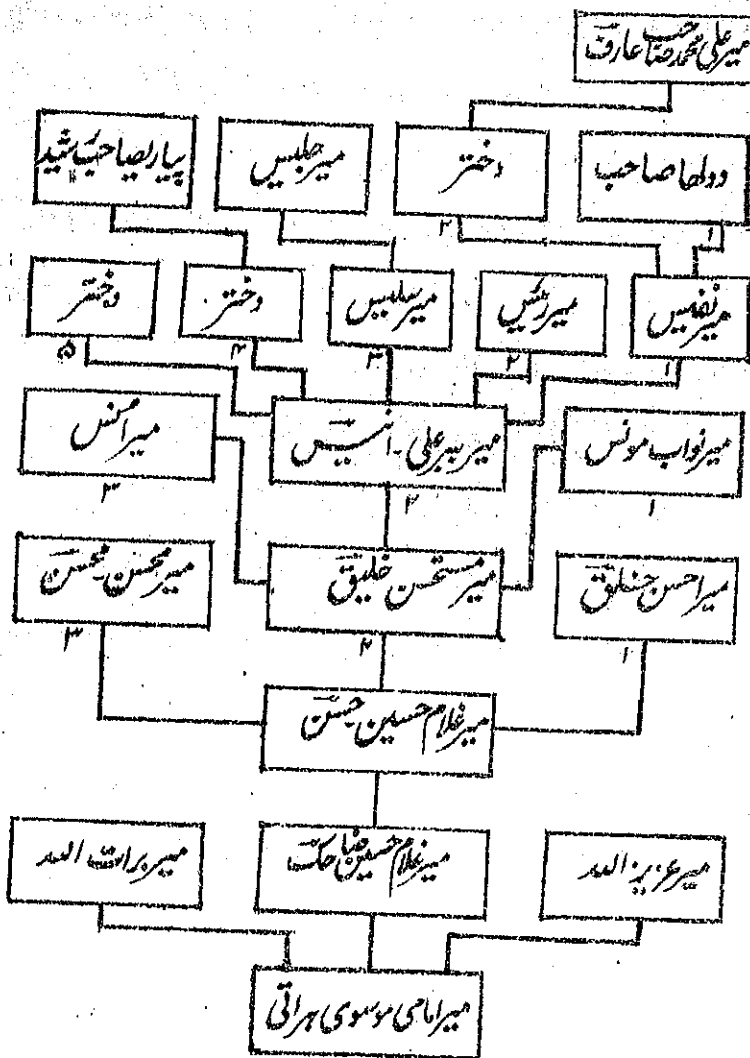
میر غلام حسین ضاحک

میر ضاحک کا نام سید غلام حسین تھا۔ تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ان کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے۔ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی لکھتے ہیں کہ دلی میں بھجل مسجد کے پاس رہتے تھے اور حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ میر مرحوم کی ولادت محلہ سید واڑہ میں ہوئی کہ پرانی دلی میں ایک محلہ تھا۔ خاندان سیادت انکا سندی تھا۔ امامی ہرودی کی اولاد میں تھے اور شاعری بھی گھرانے میں میراث چلی آتی تھی۔ میر موصوف[۱] نہایت خوش مزاج خندہ جبیں ہنسنے ہنسانیوالے تھے۔ اسی واسطے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ عربی میں شرح ملا تک اور فارسی میں استعداد تمام بہم پہنچائی تھی۔ وضع اور لباس قدمائے دہلی کا پورا نمونہ تھا سر پر سبز عمامہ عرب کی وضع کا۔ بڑے گھیر کا پاجامہ یا جبہ کہ وہ بھی اکثر سبز ہوتا تھا گلے میں خاک پاک کا کنٹھا۔ ہاتھ میں داہنی کلائی میں ایک جوڑی اس پر کچھ دعائیں کندہ چھنگلی بلکہ اور انگلیوں میں بھی کئی کئی انگوٹھیاں۔ ڈاڑھی کو مہندی لگاتے تھے۔ ریش بچہ منڈاتے تھے کبھی کبھی ہاتھوں کو مہندی ملتے تھے۔ میانہ قد۔ رنگ گورا۔ دیوان اتنک نظر سے نہیں گزرا جس پر رائے ظاہر کی جائے۔ سلطنت کی تباہی نے ان سے بھی دلی چھڑوائی اور فیض آباد (اودھ) کو آباد کیا۔ ہر چند چاہا کہ انکے جلسوں اور باہمی گفتگوؤں کے لطائف و ظرائف معلوم ہوں کچھ نہ ہوں تو چند غزلیں ہی مل جائیں۔ کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ تاریخ وفات بھی نہیں ملی۔ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی سنہ ۱۱۹۶ھ میں لکھتے ہیں کہ میر ضاحک فیض آباد میں ہیں اور وارستگی سے گزران کرتے ہیں۔ میر حسن مرحوم انکے صاحبزادے تھے جو دلی میں پیدا ہوئے اور دلی سے باپ کے ساتھ فیض آباد گئے۔ میر ضاحک کی ایک فارسی رباعی بطور تبرک نقل کی جاتی ہے۔

---

[۱] میر حسن (میر ضاحک کے صاحبزادے) فرماتے ہیں "قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالیٰ با اینہمہ قدرت علم چوں طبائع سامعان را در خور سخن بلند نیافتند بقدر حوصلۂ آنہا العطف ہزل توسن قلم را ندند بحکم آنکہ مصرع
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند	فریاد دلاں کہ غمگساراں رفتند
درخاک چو قطرہ ہائے باراں رفتند	چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار

میر حسن

میر غلام حسن نام حسنؔ تخلص تھا۔ پرانی دلی میں سید واڑہ ایک محلہ تھا وہاں پیدا ہوئے تھے۔ عالم شباب میں اپنے والد "میر ضاحک" کے ساتھ فیض آباد گئے اور نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار میں نوکر ہوگئے۔ پھر لکھنؤ گئے خندہ جبیں شگفتہ مزاج ظریف طبع تھے۔ میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ قوانین شرافت کے پابند۔ جب تک دلی میں رہے پہلے اپنے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے اودھ میں جاکر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے پھر مرزا رفیع السودا کو غزل دکھانے لگے۔ لکھنؤ میں آکر انکے کلام نے شہرت کا رنگ اڑایا۔ انکے اشعار غزل کے رنگ میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے مثنوی بدر منیر میں بینظیر کا قصہ بینظیر لکھا ہے۔ زمانہ نے اسکی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوا لیا اسکی صفائی بیان اور لطف محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا۔ اور ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے۔ اُس زمانہ کے لوگوں کے کلام میں اکثر الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں جو آج متروک و مکروہ سمجھی جاتی ہیں لیکن میر حسن کا کلام جیسا جب تھا ویسا اب ہے ہمارے ملک سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک مثنوی سحر البیان دوسرے مثنوی گلزار نسیم۔ میر حسن کا دیوان اب نہیں ملتا حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ انواع سخن سے لبریز ہے صاحب گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ میر حسن نے اپنا کلام مجھے بھیجا ہے اور جو خط لکھا ہے اُس کی اصل عبارت یہ ہے

از سائر اقسام اشعار ابیات مدونہ من ہشت ہزار بیت

تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام
مدتے است کہ از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار
جنگ و خلف ایشاں ملقب بہ نوازش علیخاں
سرفراز جنگ بہادر میگذرانم۔

میر حسن کے دو صاحبزادوں نے نام پایا۔ ایک میر خلیق۔ دوسرے میر خلق لیکن میر حسن کے بیٹوں کو زمانہ نے اتنی فرصت نہ دی جو وہ اپنے باکمال باپ کے اشعار کی تدوین کرتے اسلئے اس مجموعہ نے شہرت عام کا موقع نہ پایا۔ میر حسن نے ۱۲۰۱ہجری آغاز محرم میں رحلت کی۔ مفتی گنج لکھنؤ میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ کہتے ہیں پچاس برس سے زیادہ عمر میں انتقال کیا۔ شیخ مصحفی نے انتقال کی تاریخ لکھی۔

تاریخ

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں	رو ازیں گلزار رنگ و بو نیافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی	شاعر شیریں زباں تاریخ یافت

اب میں رسالہ اردوئے معلی علی گڑھ سے میر حسن کے مزید حالات کا اقتباس کرتا ہوں۔

میر حسن

از ۱۱۴۰ہجری تا ۱۲۰۱ہجری

نام و خاندان میر غلام حسن نام حسن تخلص خلف میر غلام حسین ضاحک، آبا و اجداد انکے ہرات کے رہنے والے تھے۔ امامی ہروی نے کہ میر حسن کے جد تھے انقلاب زمانہ کے ہاتھوں وطن اصلی کو چھوڑ کر پرانی دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ میر ضاحک دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور میر حسن کا ابتدائی زمانہ بھی وہیں بسر ہوا۔

وضع وعادت اس باب میں منشی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء کی زبان میں گارسن ڈتاسی کا قول اسطرح پر ترجمہ کیا ہے کہ میر حسن اپنے باپ کے خلاف اسباب میں تھا کہ ڈاڑھی اپنی بالکل صفاچٹ کرواتا اور پگڑی اگلے وقت کی لوگوں کی سی باندھتا اور پوشاک اپنے باپ کی سی[1] پہنتا قد اچھا بڑا تھا رنگ بھورا۔ وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا۔ مگر بیہودہ اور کلام معیوب زبان سے کبھی نہ نکالتا تھا۔ سوائے ازاں شیریں مزاج اور پسندیدہ تعلیم یافتہ تھا کسی نے اُسکو بُرا نہیں لکھا اور نہ کچھ الزام لگایا لیکن بعض کتابوں میں جو انکی تصویر دیکھنے میں آئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے سر پر بانکی ٹوپی۔ تن میں تنزیب کا انگرکھا پھنسی ہوئی آستینیں کمر سے دوپٹہ بندھا ہوتا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ دہلی میں انکا طرز لباس وہی ہوگا جو اُنکے والد کا تھا لیکن قیام لکھنؤ کے زمانہ میں اس میں بہت کچھ تبدیلی ہوکر آخرکار وہی وضع قرار پاگئی۔

سلسلہ شاعری میر حسن کو لڑکپن ہی سے شعر وشاعری کا بدرجہ کمال شوق تھا۔ چنانچہ بزمانہ نوعمری شاہجہان آباد میں میر درد سے غزل کی اصلاح لیتے تھے۔ پھر جب فیض آباد میں آباد ہوئے تو ضیاء الدین ضیا اصلاح دیتے تھے۔ کبھی کبھی میرزا رفیع السودا کو بھی غزل دکھا لیتے تھے لیکن درحقیقت میر حسن مستقل شاگرد ضیا کے ہیں جو میر تقی کے شاگرد تھے۔

علمی استعداد مولوی کریم الدین[2] لکھتے ہیں کہ میر حسن عربی نہ جانتے تھے لیکن فارسی سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور فارسی میں عمدہ شعر کہتے تھے۔

اولاد وشاگرد میر حسن نے باوجود کامل اُستاد ہونیکے کسی کو اپنا مستقل شاگرد بنانا پسند نہ کیا حتی کہ اپنے صاحبزادے میر مستحسن خلیق کو بھی خود اصلاح نہ دی بلکہ مصحفی کے سپرد کر دیا یہی وجہ ہے کہ دنیائے غزل گوئی میں اُنکا سلسلہ شاعری بہت جلد ناپید ہوگیا لیکن جو کچھ ان سے نہواوہ بامر الٰہی انکی اولاد سے ظاہر ہوا۔ اور اس شان سے ظاہر ہوا کہ اُنکے پوتے انمیں مونس۔ انیس۔ اُردو زبان کی ایک صنف کے موجد قرار پاسکے۔ اور فن مرثیہ گوئی

---

[1] سبز عمامہ اور جامہ میر ضاحک کی خاص وضع تھی۔ [2] تاریخ شعرائے اُردو از گارسن ڈتاسی۔

کا ایک ایسا نمونہ چھوڑ گئے جسکے اس وقت ہزاروں پیرو موجود ہیں اور غالباً ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔

میر حسن کے چار بیٹوں میں سے تین شاعر تھے "میر مستحسن خلیق" میر حسن خلق "میر محسن محسن" ان سب کا قیام فیض آباد میں رہتا تھا۔ چنانچہ خلیق و محسن بہو بیگم صاحبہ والدہ نواب آصف الدولہ کے داماد میرزا تقی کی سرکار سے متعلق تھے اور میر خلق دار اب علی خان کی خدمت میں رہتے تھے خلیق و خلق سے ایک ایک دیوان بھی یادگار ہے۔

تصانیف میر حسن کی تصانیف سے "دیوان حسن" مشتمل بر جملہ اقسام سخن اور مثنوی بدر منیر اس وقت تک موجود و مشہور ہیں۔ اگرچہ دیوان بہت کمیاب ہے تذکرہ شعرائے ریختہ نایاب ہے۔ اور یہی حال انکی اور دو مثنویوں کا بھی ہے ایک مثنوی میں شاہ مدار کی چھڑیوں کا حال لکھا ہے اُس میں فیض آباد کی اور لکھنؤ کی ہجو لکھی ہے۔ اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں کے جانے والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔

خاتمہ دہلی چھوڑنیکے بعد میر حسن فیض آباد اور بعد ازاں لکھنؤ میں جاکر مقیم ہوئے جہاں انہوں نے بڑی شہرت پائی اور نواب سالار جنگ اور نیز اُن کے بیٹے نواب مرزا نوازش علیخاں صفدر جنگ کی مصاحبت میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کی اور آخرکار وہیں عشرہ اول ماہ محرم ۱۲۰۱ھ ہجری میں بعہد نواب آصف الدولہ وفات پائی۔ اور عقب باغ نواب قاسم علی خاں واقع محلہ مفتی گنج میں مدفون ہوئے۔

انتقال کے وقت آپ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی شیخ مصحفی نے شاعر شیریں زباں سے مادہ تاریخ نکالا۔

میر حسن کی شاعری

میر حسن کا طرز کلام زیادہ تر میر اور کسی قدر سودا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا نظر آتا ہے

بیان سے گو کہ زبان کو دیکھئے تو وہ بھی انہیں دونوں بزرگوں کی سی ثابت ہوتی ہے فارسی ترکیبوں کے ترجمے ان کے غزلوں میں بھی دلپذیری کی اُسی شان میں نمودار پائے جاتے ہیں جس کا جلوہ سودا اور قایم کی سحر طرازیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دیکھتے ہی مے کو ساغر کا نہ کھینچا انتظار
طرفہ تر یہ ہے کہ اپنا بھی نہ جانا اور یونہیں
مارے جلدی کے میں اپنا ہاتھ پیمانہ کیا
اپنا اپنا کہہ کے مجکو سب سے بیگانہ کیا

اصناف سخن میں سے میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہ تھے[۵۱]۔ البتہ غزل سرائی میں اُن کا صاحب امتیاز اور مثنوی گوئی میں یکتائے زمانہ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

میر حسن[۵۲] کی غزلوں کا رتبہ اُنکی مثنوی کے برابر بلند نہیں پھر بھی بقول صاحب آبحیات اُنکے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے چند اشعار بسبیل تذکرہ ملاحظہ ہوں۔

رو رو کے کیا ابتر سب کام مرے دل کا
آغازِ محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا
طوفان ہیں زلفوں پر بہتان ہے کاکل پر
جبتک میں جیا مجھکو قاصد نہ ملا آخر

کھو یا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا
کیا جانئے کیا ہوگا انجام مرے دل کا
ہے رشتہ الفت ہی یہ دام مرے دل کا
اب جی ہی چلا لے کر پیغام مرے دل کا

معشوق کی الفت سے مت جان حسن خالی
لبریز محبت سے ہے یہ جام مری دل کا

۵۱- میر حسن نے قصیدہ کہا ہی نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدح سرائی کو ناپسند کرتے تھے (اشہری)

۵۲- اکثر اساتذۂ فارسی کے کلام میں بھی ایک چیز خاص دیکھی جاتی ہے جو بات اسی شاعر کے دوسری تصنیف میں نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے فیضی کے نلدمن میں جو بات ہے وہ دیوان میں نہیں۔ فردوسی نے جو کام شاہنامہ میں کیا وہ یوسف زلیخا میں بن نہ پڑا (اشہری)

مرا سے استقامت سے مثالِ شمع مرجانا	جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سر سے گذر جانا
کوئی دن کے ہیں مہماں اس چمن میں ایکدن آخر	مثالِ نکہتِ گل شام جانا یا سحر جانا
دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں	پانوں دیوانہ نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

میر خلیق

میر حسن کے چار صاحبزادوں میں تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیقؔ۔ میر احسن خلقؔ۔ میر محسن محسنؔ مگر میں صرف میر مستحسن خلیق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انکی تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر تیرہویں صدی ہجری کے نصف اول میں انکا زور شور پایا جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ میر خلیق نے فیض آباد اور لکھنؤ میں تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی۔ ابتدا میں غزل کہتے اور والد بزرگوار سے اصلاح لیتے پھر میر حسن نے اپنے ہونہار فرزند میر خلیق کو شیخ مصحفی کے سپرد کر دیا اور شیخ صاحب اصلاح دینے لگے میر خلیق صاحب دیوان تھے مگر اُسے رواج نہیں دیا اور مرثیہ گوئی پر توجہ کی۔ سرمایہ مضامین جو بزرگوں سے ورثہ پہنچا تھا۔ اُسے زادِ آخرت میں صرف کیا اور اُس میں خاص نام پایا۔ اپنا کہا ہوا مرثیہ خود ہی مجلسوں میں پڑھتے تھے۔ قدردان آنکھوں سے لگا لگا کر لیجاتے تھے۔

میر خلیق کی مرثیہ گوئی سے پہلے اکثر مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ ہر چہار مصرعہ کے بعد قافیہ۔ وہ انداز موقوف ہوا۔ ایک سلام غزل کے انداز میں۔ اور مرثیہ کے لئے مسدس کا طریقہ آئین ہو گیا۔ وہ سوز اور تحت اللفظ دونو طرح پڑھا جاتا تھا۔ اور چونکہ سلام مستزاد کے اسلوب پر کہتے تھے وہ نوحہ کہلاتا تھا۔ اُسے سوز میں پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ ابتک جاری ہے۔ اُس زمانہ میں "میر ضمیرؔ" ایک مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے جو علوم عربیہ میں بھی استعداد کامل رکھتے تھے اور نہایت متقی اور پرہیز گار شخص تھے وہ بھی غزل وغیرہ سے دست بردار

ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو نقطہ مقابل کر کے تعریفیں شروع کر دیں طبیعتیں ایک دوسرے کی چوٹ پر زور آزمائی کر کے نئی نئی ایجاد پیدا کرنے لگے۔ اُس وقت مرثیہ ۳۰۔ ۴۰ حد ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ میر ضمیر مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا۔

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

اس میں شہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا پھر سراپا لکھا۔ پھر میدانِ جنگ کا نقشہ دکھایا۔ اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ پہلا ایجاد تھا اس لئے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں۔ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا۔ یہ ایجاد مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روشش متروک ہو گئی اور سب اس کی پیروی کرنے لگے۔

عہد مذکور میں چار مرثیہ گو نامی تھے۔ میر ضمیر[۱]۔ میر خلیق[۲]۔ میاں دلگیر[۳]۔ میاں فصیح[۴]۔ میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی اس لئے مرثیہ خوانی نہ کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی اُنھوں نے مرثیت کے دائرے سے قدم نہیں بڑھایا۔ مرزا فصیح حج و زیارت کو گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کے لئے میدان خالی رہا کہ جولانیاں دکھائیں۔ دنیا کے تماشائی دونو استادوں کی تعریفیں کر کے لڑواتے تھے اور دونوں کی استادیوں کا لطف اُٹھاتے تھے مگر دونوں صاحب اخلاق اور سلامت روی کے قانون داں تھے کبھی ایک جلسہ میں جمع نہ ہوتے تھے آخر ایک صاحب نے ان دونوں کو ایک مجلس میں جمع کرنے کی تجویز نکالی۔

میر ضمیر اور میر خلیق کا ایک مجلس میں جمع ہونا

جب وہ تجویز قرار پا گئی نواب شرف الدولہ بہادر مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دیکر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیر مرحوم کے مکان پر گئے اور گفتگوئے معمولی کے بعد پانسو روپے کا توڑا سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کل مجلس ہے مرثیہ

آپ پڑھیے گا۔ اس کے بعد میر خلیق کے یہاں گئے اُن سے بھی وہی مضمون ادا کیا۔ اور ایک
کو دوسرے کے حال کی خبر نہ تھی۔ روز معین پر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ ایک بجے
کے بعد میر ضمیر ممبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ چاروں طرف سے
واہ واہ سبحان اللہ کا شور بلند ہوا۔ اسی میں میر خلیق بھی پہنچے۔ اور حالت موجودہ کو دیکھ کر
حیران رہ گئے۔ اور دل میں کہا کہ آج کی شرم خدا کے ہاتھ ہے۔ میر ضمیر نے جب انہیں
دیکھا تو اور زیادہ پھیلے اور مرثیہ کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں میں تحسین بلکہ وقت
میں گنجائش بھی نہ چھوڑی۔ آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا۔ وہ ابھی ممبر سے اترے ہی تھے
کہ چوبدار ان کے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ آپ بھی حاضرین کو داخل حسنات
فرمائیں اس وقت ان کے طرفداروں کی بالکل صلاح نہ تھی مگر یہ توکل بخدا اُٹھ کھڑے ہوئے
اور ممبر پر جا بیٹھے چند ساعت توقف کیا اور بہت دھیمی آواز سے چند رباعیاں پڑھیں پھر مرثیہ بھی
اسی دھیمی آواز سے شروع کیا۔ چند بند پڑھنے کے بعد دفعتاً با کمال نے رنگ بدلا اور اسکے ساتھ
ہی محفل کا بھی رنگ بدل گیا۔ آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا۔ اور نالہ و زاری نے آنسو بہانے
شروع کئے پندرہ بیس بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵-۳۰ بند پڑھ کر
اتر آئے۔ اہل مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ممبر خالی تھا نہ معلوم نہ ہوا
کہ میر خلیق صاحب کس وقت ممبر سے اتر آئے۔ دونوں کے کمال پر نعرہ تحسین بلند ہوا۔
اور طرفین کے طرفدار سرخرو گھروں کو پھرے۔

میر خلیق کا اندازِ بیان

میر خلیق کے کلام کا انداز۔ اور خوبی محاورہ۔ اور لطف زبان یہی سمجھ لو جو آج میر انیس کے
مرثیوں میں یہاں دیکھتے ہو۔ میر خلیق کا پڑھنا بھی بے مثل تھا۔ اعضا کی حرکت سے بالکل کام
نہ لیتے تھے۔ فقط نشست کا انداز اور آنکھ کی گردش تھی۔ اس میں سب کام ختم کر دیتے تھے

میر انیس مرحوم کو بھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اٹھ جاتا تھا۔ یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی جو کام کر جاتی تھی۔ ورنہ کلام ہی سارے مطالب کے حق پورے پورے ادا کر دیتا تھا۔

میر خلیق نے بڑھاپے کے سبب سے اخیر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا خود کہتے ہیں ؎

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا	دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب	باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

ان کے گھرانے کی زبان سب کے نزدیک سند ہی تھی۔ شیخ امام بخش ناسخ کہا کرتے تھے کہ زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے ہاں جایا کرو۔

میر خلیق کے تین صاحبزادے تھے۔ انیسؔ۔ مونسؔ۔ انسؔ۔

میر انیس کی پیدائش

میر مستحسن خلیق کو خدا نے ایک بیٹا عنایت کیا۔ جو ابھی ایک ستارہ ہی لیکن آگے چل کر شاعری کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا۔ اور امام علیہ السلام کی خدمات سے اپنے فرجد "امامی ہروی" کا نام روشن کرنیوالا ہوگا۔

اس وقت میر خلیق کی حالت معمولی طور کی تھی۔ فیض آباد میں تھے اور کبھی کبھی لکھنؤ تشریف لایا کرتے تھے۔ صاحبزادے کے پیدا ہوتے ہی کاشانہ سیادت روشن ہوگیا اور گھر میں ایک نئی دولت کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ضروریات خانگی میں بھی غیر متوقع سہولتیں پیدا ہوگئیں اور ایک باطنی روح مشکلکشائی کو آمادہ پائی جانے لگی۔ صورت کا رعب و داب دیکھ کر ببر علی نام رکھا گیا۔

اس موقع پر سب سے زیادہ ضروری صاحبزادہ کے سال ولادت کا ظاہر کرنا ہے لیکن افسوس کہ جیسے امامی ہروی میر ضاحک۔ میر حسن۔ میر خلیق کی پیدائش اور وفات کی صحیح تاریخ اور ماہ

سال کا پتہ نہیں ملتا۔ صرف میر حسن کی تاریخ وفات معلوم ہوتی ہے جو شیخ مصحفی نے لکھی
ویسے ہی اس صاحبزادہ گرامی کا سال ولادت مشہور نہیں ہوا۔ جو تذکرہ نہیں لکھا جاتا۔ اور تو اور
مولانا محمد حسین صاحب آزاد مصنف آبحیات جیسے محقق کی تحقیق میں بھی اسکا پتہ نہیں ملتا۔

میر خلیق نے صاحبزادہ گرامی کی تعلیم و تربیت کا وہیں فیض آباد میں بندوبست کیا اور
خود اُنکے خاندان کی تعلیم و تربیت پہ پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں
شاعری کا شوق ہوا شفیق اور لایق باپ نے انیس تخلص تجویز کیا۔ پھر صاحبزادہ کو عنفوان
شباب میں لیکر لکھنو تشریف لائے۔ میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اور ۱۲۹۱ھ ہجری
میں رحلت فرمائی اس حساب سے ۱۲۱۹ھ یا اُسکے قریب قریب زمانہ پیدائش معلوم ہوتا
ہے جو قمری حساب سے سمجھنا چاہئے ورنہ شمسی حساب سے ڈھائی برس
اور کم ہو جائیں گے۔ ۵۶ - ۵۷ برس مشق سخن میں گزرے۔

میر انیس کی تعلیم

میر انیس کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی جب لکھنو تشریف لائے تو یہاں اپنی
پرائیویٹ تعلیم کو جاری رکھا اور چالیس برس کی عمر تک مطالعہ کتب سے بے نیاز ہوئے
لکھنو میں میر انیس کو عالمانہ درجہ میں تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن انکی معلومات علمیہ کا سب
کو اقرار ہے۔ علی محمد خاں صاحب شاد رئیس عظیم آباد اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ
میر صاحب کا مذاق علمی اس درجہ کو پہنچا ہوا تھا جو شاعری کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکتا
ہو جو ایسے مستند استاد کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک
صاحب سدرہ کی ایک عبارت پر بحث کر رہے تھے اور میر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے
وہ آواز میر صاحب کے کان میں پڑ گئی۔ میر صاحب نے فرمایا کیا بحث ہے اُنھوں نے ادب سے
سامنے آکر وہ مقام پیش کیا۔ میر صاحب نے دیکھا بھی نہیں اور زبانی وہ عبارت پڑھکر اُس

مسئلہ کو اپنے لاثانی حسن بیان سے اس خوبی کے ساتھ حل کیا کہ ہم سب سنکر دنگ ہو گئے
میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی اور اکثر میر صاحب
کے زیر مطالعہ وہی کتابیں رہتی تھیں جو اپنا مثل نہیں رکھتیں اور عام دلچسپی کی مستحق ہیں۔
میر صاحب کی مختصر لائبریری میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع تھیں جو سب کی
سب انکی نظر سے گزر چکی تھیں۔
میر صاحب کے پاس اکثر اعلیٰ درجہ کے علما ادبا و مستند باکمال تشریف لاتے تھے
اور میر صاحب ہر ایک سے انکے درجہ و مقام کے موافق گفتگو فرماتے تھے۔

میر انیس کی تربیت

میر انیس کے گھر اور خاندان میں ہندوستان کی شاہی فیملی کے طرز و انداز اور ایران کی
طرز معاشرت اور شریفانہ اخلاق و آداب کے مکمل نمونے جمع ہو گئے تھے جو بوڑھوں سے جوانوں
اور جوانوں سے لڑکوں بچوں کو مسلسل طور سے پہنچے تھے اور انکی آنکھوں نے دلی لکھنؤ
فیض آباد میں ہر طرح کی حسن معاشرت اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے اخلاق و ادب کو دیکھ کر
خود کو اعلیٰ تہذیب کا بہترین نمونہ بنا رکھا تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اخلاق شرافت
اور آداب ثقاہت سے واقف اور انکی پابند تھیں۔ چنانچہ میر محمد رضا رضی تاریخ[1] تاج الخواتین
میں لکھتے ہیں کہ میر خلیق کی پاکدامن بی بی (یعنی میر انیس کی والدہ ماجدہ) مسائل مذہب اثنا
عشری سے واقف تھیں اور فارسی اتنی جانتی تھیں جو جامع عباسی کو پڑھ لیتیں اور پڑھا
دیتی تھیں وہ نماز روزہ کی پابند اور انتہا سے زیادہ پرہیزگار تھیں وہ ہر بات کو مذہب امامیہ

---

[1] یہ تاریخ بیگمات اور خواتین لکھنؤ اور فیض آباد کی ہے جس میں بہو بیگم اور جناب عالیہ اور بیگم صاحبہ مادر جیسی قدر
وغیرہ کے حالات ہیں جنکی فیاضی اور اولوالعزمی پر لکھنؤ فخر کر سکتا ہے انکے ساتھ اس زمانہ کی لائق یا انکی
ہم صحبت شریف خواتین کا بھی ذکر ہے۔

اثنا عشریہ کے موافق کرنا چاہتی تھیں۔ انکی وضع اُن کا لباس اُن کی رفتار وگفتار دوسری بیبیوں کے لئے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بڑی بڑی امرازادیاں اور بیگمات اُنسے ملنے کی خواہشمند رہتی تھیں لیکن وخل کیا جو وہ بغیر کسی تقریب وطلب کے گھر سے باہر جائیں وہ خود کو ہر باب میں پابند ادب رکھنا پسند کرتی تھیں اور انکو اخلاق رزیلہ اور بے ادبی سے سخت نفرت تھی۔

پس میں کہتا ہوں کہ میرانیس کو اعلےٰ تربیت کا ابتدائی عملی حصہ جو اپنی مادر محترم کی ترتیب وتادیب سے حاصل ہوا وہ خاص قسم کا ہے جو بڑے سے بڑے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

میرانیس کی تعلیم وتربیت کے لئے خود انکا گھر اور انکا خاندان ایک نہایت قابل قدر کالج کے بورڈنگ ہوس سے بہتر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسکے بعد عنفوان شباب میں لکھنؤ کا قیام جبکہ خود لکھنؤ کے وضیع وشریف ہر باب میں اعلیٰ تہذیب کا نمونہ بن رہے تھے اور یہاں کے ادنی واعلیٰ میں خودداری کی روح پھونکی ہوئی تھی اور بازار سے لیکر دربار تک پسندیدہ اخلاق وادب کی پاسداری کی جاتی تھی اور سیکڑوں امیروں کی ڈیوڑھیاں مرجع ادب نظر آتی تھیں۔ میرانیس جیسے نقاد وخوش فکر کیلئے کیسا لاثانی جولانگاہ ہوسکتا ہے ناظرین خود اندازہ کرلیں۔ میرانیس کو یہاں جیسے علماء وادبا اور امراء وزرا کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور عام مجالس میں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے اجتماع سے جو ایک خاص قسم کا غیر معمولی اکتساب میرانیس کے دل اور دماغ نے کیا وہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ناممکن ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میر انیس اور فنون سپہگری

دلی میں میر کاظم علی سفید پوش۔پٹہ۔بانک۔بنوٹ کے اُستاد تھے۔ مگر جب دلی کے اہل کمال باہر جانے پر مجبور ہوئے تو میر کاظم علی لکھنؤ میں تشریف لائے اور میر خلیق کے مکان کے پاس مکان لیا۔ اس سے پہلے دونوں خاندان دلی میں بھی ایک دوسرے سے تعارف رکھتے تھے اور میر انیس نے امرازادگان فیض آباد کے ساتھ اور اپنے ذاتی شوق سے ایک حد تک شہسواری اور سیف زنی کی مشق کی تھی اور طبعیت میں اُس کا شوق باقی تھا۔ اس لئے میر خلیق نے میر کاظم علی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ میرے لڑکے کو کچھ بتادیا کریں۔ میر کاظم علی نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا۔ لیکن وہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے اس لئے اُنہوں نے اپنے بیٹے میر امیر علی کو اس کام پر مامور کردیا میر انیس نے علی مدلکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی کچھ گھائیاں اُن سے سیکھیں یہانتک کہ وہ اس باب میں بہت بڑی صفائی اور چابکدستی ظاہر کرنے لگے۔ بلکہ کسی کسی کام میں میر امیر علی پر چوٹ کرجاتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کی بھاگڑ میں میر امیر علی بی بی بچوں کو لیکر بنارس چلے گئے وہاں سے حیدرآباد جانے کا قصد کیا۔ درمیان میں نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ سابق ریاست بھوپال کے حضور میں رسائی ہوئی۔ مردم شناس رئیسہ نے میر امیر علی کی شریفانہ وضع اور قابل دربار صورت دیکھ کر انکو روک لیا اور بعد چند سال جب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ (جو اب والیہ ریاست ہیں) نو دس برس کی ہوئیں تو اُن کو لکڑی سکھانے پر مامور کردیا بھوپال میں میر امیر علی کئی برس تک میرے ہم محلہ رہے ہیں وہ اکثر میر انیس کے حالات بیان کرتے رہتے تھے۔

میر امیر علی کہتے تھے کہ میر انیس کو اُس عمر اور اُس حالت میں بھی اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی خودداری کا اتنا خیال رہتا تھا کہ میں نے کبھی میر انیس کو ننگا نہیں دیکھا اور نہ وہ

ننگے بدن مشق فن کرتے تھے بلکہ اُس کے مناسب کپڑے بنائے تھے اور بالاخانہ کی چھت پر
مشق کرتے تھے جہاں میرے اور اُنکے سوائے دوسرا نہ ہوتا تھا اُنکا قول تھا کہ اگر میر انیس
کے ہاتھ میں ایک گرہ لٹھے کے رومال میں مدوشاہی یا بھوپال کے چار پیسے والا پیسہ بندھا
ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے اور اُنکی چوٹ کو بنوٹ
جاننے والے کے سوائے کوئی روک نہ سکتا تھا۔

میر انیس اور ورزش

میر انیس کے خاندان میں عام طور سے ورزش کا چرچا تھا۔ اور میر انیس نے تو تمام عمر
اس کی پابندی کی۔ میر صاحب ایک علاحدہ کمرہ میں ورزش کرتے تھے جہاں دوسرا کوئی
نہ جا سکتا تھا۔ میر صاحب کی ورزش معتدل ہوا کرتی تھی جو حفظ صحت اور تنومندی کے
لئے ہر وقت کے مناسب حال تھی۔ نہ اتنی کم جس کا اثر محسوس نہ ہو نہ اتنی زیادہ جو پہلوانوں
کی طرح پسینے پسینے کر ڈالے۔ ڈنڑ فرش پر کرتے تھے جو عموماً پچاس ساٹھ کی تعداد میں ہوتے
اور سو دو سو ہاتھ مگدر کے ہلاتے۔ اور اپنے جسمانی بناؤ سدھار کا خاص خیال رکھتے۔ آخر
میں ورزش گھٹ گئی تھی اس پر بھی کہتے ہیں کہ چند ڈنڑ کرنا اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر کے ہلانا
موقوف نہیں ہوا۔

میر انیس کی خلوت

میر انیس کو اپنی خودداری کا بہت بڑا خیال رہتا تھا اسلئے مخصوص اوقات میں وہ اپنے
خاص خانہ میں تشریف لیجاتے۔ اور اندر سے دروازہ کی زنجیر بند کر لیتے تاکہ کوئی ایک لڑکا تک

[1] یہی وجہ ہو کہ میر انیس جن مقامات پر میدان جنگ میں مبارزوں کے فنون جنگ اور ایکدوسرے کے داؤں پیچ اور
نیزہ بازی وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں تو اُنکی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو بغیر معلومات فن کے ناممکن ہے (اشہری)

اندر نہ آئے۔ یہاں بے تکلف ہو کر بیٹھتے کبھی ٹہلنے لگتے۔ کبھی دوسرے شغل سے جی بہلاتے اس مکان میں ایک حوض بھی ہے۔ اکثر موسم گرما میں اوس میں غوطے لگاتے اکثر اسی حالت خلوت میں دس دس بیس بیس پچاس پچاس بند کہہ ڈالتے جو اُن کے لوح حافظہ پر لکھ جاتے۔ اور جب باہر تشریف لاتے تو میر مونس یا میر نفیس یا اور کسی عزیز و شاگرد سے جو حاضر ہوتا لکھنے کا ارشاد کرتے اور مسلسل لکھوا دیتے۔

میر انیس کا دربار

ہرچند طبقہ شعرا میں شہزادہ علی حزیں۔ اور میر تقی میر اور شیخ امام بخش ناسخ وغیرہ کی ناز دماغیاں مشہور ہیں لیکن میر انیس اعلی اللہ مقامہ کی تمکین و خودداری نے اُنکے رکھ رکھاؤ میں ایک شاہانہ حالت پیدا کر دی تھی جو ایک ایسے عالی دماغ اور بادشاہ اقلیم سخن کے لئے زیبا ہو سکتی ہے۔ انکی ہر بات ایک قاعدہ کی پابند تھی۔ اُنکے اخلاق و آداب اور معاشرت کا دستور العمل جیسے اُن کی اپنی ذات سے ہر دفعہ کی پابندی کراتا تھا ویسے ہی دوسرے کو حد ادب سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا میں نے جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور نواب بدھن صاحب جیسے اکابر لکھنؤ سے سُنا ہے کہ میر صاحب تک پہنچنے اور اُن سے ہمکلام ہونیکے لئے درباری قسم کے چند قواعد کی پابندی لازم تھی۔ کوئی یوں بے تکلف سامنے نہ جا سکتا تھا جب تک میر صاحب اُسکے آنے کی اجازت نہ دیں۔ یا ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے روزمرہ کے آنے جانیوالے بھی ایک اطلاع کے بعد باریاب ہوتے تھے۔ اور جب میر صاحب باہر تشریف رکھتے تھے تو اپنی وضع کے پورے لباس میں زیب افزائے صدر نظر آتے تھے اُن کی معمولی باتوں میں بھی ادائے کلام سے اعجاز فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔ اور وہ سحر بیانی اُنکا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور اُن پر ختم ہو گئی جس کو اُن کے دیکھنے والے آج تک یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محو حیرت

بناتے ہیں اور میر انیس جس دن سے لکھنؤ تشریف لائے بغیر پینس کے بہت کم باہر نکلے جو پچھلے زمانہ میں امیرانہ سواری تھی اور اکثر ثقات شہر اسی پر سوار ہوتے تھے

میر انیس کی حُسن پرستی

میر انیس کی طبیعت حسن پرست واقع ہوئی تھی جو ایک ایسے شاعر کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ اگر وہ صفت نہ ہو تو ایسا شاعر بن ہی نہیں سکتا۔ میر صاحب کو ایک اچھے پھول کا دیکھ لینا اُن کے وجدان کی تحریک کا ذریعہ ہو جاتا تھا۔ میر صاحب جمادات نباتات حیوانات میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے۔ یہی وجدان ہے جو جابجا انکی تصنیف سے رنگ گل بنکر پھوٹا نکلتا ہے۔ اسی وجدان نے انکو مناظر قدرت کے پُربہار وادی میں ہر برگ وگل کو دیکھ کر لفظوں میں اُس کی تصویر اتارنے سے بہزاد و مانی پر فائق کردیا ہے۔

میر انیس کی شکل وصورت

(۱) میر انیس کا قد لانبا۔ چھریرا۔ متناسب الاعضا رتھا۔

(۲) سر کے بال باریک اور ملایم۔

(۳) چہرہ خوبصورت وکتابی۔

(۴) رنگ کھلا ہوا گندمی۔

(۵) آنکھیں بڑی بڑی۔ خوبصورت جنکی خوش آب سفیدی نرگس کا لطف دیتی تھی۔ آنکھوں کے تیور سے غیورانہ حالت ظاہر ہوتی تھی۔ پتلی کی روشنی بہت تیز تھی۔

(۶) موچھیں بڑی بڑی اگندہ مو۔ ڈاڑھی صاف۔

(۷) گردن صراحی دار۔ گردن فراز کے معنی ظاہر کرنے والی۔

(۸) سینہ کشادہ اور عریض مگر زیادہ اُبھرا ہوا نہیں۔
(۹) چال نہایت نستعلیق۔ دخل کیا جو نیچے تلے قدم سے آگے بڑھ جائے۔

میر انیس کی وضع

میر انیس لکھنؤ میں اُس وقت تشریف لائے جبکہ درباری لباس ایک خاص تہذیب کا پابند تھا اور ثقات شہر نے اپنے لئے ایک خاص وضع اختیار کر رکھی تھی جو دلی کے بعد لکھنؤ کے لئے خاص سمجھی جاتی تھی اور اُس کو دیکھ کر لکھنؤ کی بود و باش کا امتیاز ہوتا اور وہ بالکل مشرقی لباس سے مرکب تھی۔ اس وقت میں میر صاحب نے اپنے لئے وہ لباس اختیار کیا جو آخر وقت تک اُن کے جسم پر موزوں رہا۔ اور اس درمیان میں لکھنؤ کی وضع میں کئی تغیرات ہوئے اور زبان نے بھی کئی رنگ بدلے لیکن میر انیس کی وضع ان کی زبان کی طرح وہی رہی جو پہلے تھی۔

میر انیس اپنے سر پر لکھنؤ کی بفیناوی پیچ گوشہ ٹوپی اس صورت کی لگاتے تھے۔ اور ٹوپی کی درستی اور خوبصورتی سے لگانے میں اُنکو بڑی دلچسپی رہتی تھی جب وہ کہیں تشریف لیجاتے تو گولوں پر چڑھی ہوئی آٹھ دس ٹوپیاں حاضر کی جاتیں وہ جسکو پسند فرماتے اُسکو سر پر رکھتے اور آئینہ سامنے رکھ کر اُسکو بار بار درست کرتے۔ جبتک وہ صحیح موزونیت حاصل نہ کرتی وہ اس شغل سے باز نہ آتے۔ بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ ٹوپیوں کے تبدیل بدل اور اس شغل میں صرف ہو جاتا۔ آخر میں جب کوئی ٹوپی صحیح مقام حاصل کر لیتی تو پھر اُس مقام سے نہ ہٹاتے اور جبتک واپس آتے وہ ٹوپی اسی مقام پر اُسی شان سے قایم رہتی جسم میں ایک خاص وضع کا گھیر دار کرتہ پہنتے تھے۔ اور صرف یہی کرتہ انکی وضعداری کو خاص امتیاز سے ظاہر کرتا تھا کبھی گول پردہ کا انگرکھا زیب جسم فرماتے تھے۔ اور لکھنؤ کے عام رواج کے موافق غرارہ کا ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے پانوں میں لکھنؤ کی زرد مخملی جوتی شرف پابوسی حاصل کرتی تھی ہاتھ میں پتلی چھڑی اور

سفید رومال ہوتا تھا۔

میر انیس کی پہلی مجلس

جن دنوں میر انیس لکھنؤ تشریف لیگئے تو لکھنؤ اپنے شباب کے مزے لے رہا تھا ایک طرف شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے مشاعروں سے شاعری کی دنیا گونج رہی تھی دوسری جانب میر ضمیر اور میر خلیق کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی تمام شہر میں دھوم تھی اور شیعہ پارٹی کے زن و مرد بلکہ بچہ بچہ کو اعلیٰ مرثیہ سُننے کا شوق تھا۔ اس موقع پر میر خلیق چپکے چپکے اپنے صاحبزادہ میر انیس کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا عمدہ نمونہ بنانے پر متوجہ تھے اور خود میر انیس کا صحیح وجدان اس باغ میں ایک نئی بہار پیدا کرنیکے لئے آمادہ تھا۔

اس حالت میں میر انیس نے اکثر رباعیاں۔ متعدد سلام اور چند مرثیے تصنیف کر کے اپنے شفیق اور استاد باپ کو دکھائے۔ اور تحت لفظ پڑھنے میں بھی مکان کے اندر بیٹھکر بہت کچھ مشق فن کر لی۔

میر خلیق خاص خاص مجلسوں میں میر انیس کو بھی ساتھ لیجاتے۔ یہ قریب ممبر کے بڑی تمکین و متانت سے بیٹھتے اور ختم مجلس تک اُسی شان سے بیٹھے رہتے۔ زانو بدلنا کیسا کوئی عضو بھی بیقاعدہ حرکت نہ کرتا۔

میر انیس کی اس حسن متانت سے ارباب مجلس کے دلوں میں ایک خاص گنجائش پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اور بعض نے میر خلیق سے صاحبزادہ کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے حالات دریافت کر کے انکی تصنیف اُنکی زبان سے سننے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر کار ایک بہت بڑی مجلس میں میر خلیق نے مرثیہ پڑھا اور حسب معمول بے انتہا تعریف ہوئی اور کمال مجلس بھی حاصل ہوا لیکن آواز کے ضعف نے ارباب مجلس کے دلوں پر دلولہ انگیز اثر نہ ڈالا جو کہ

کہ شفیق باپ نے خود اپنے بیٹے کے دل بڑھانے اور مجلس پر اپنے ہونہار فرزند کے جلد پیدا اثر کو نمایاں کرنے کی غرض سے اپنی آواز میں ضعف کے آثار پیدا کرلئے ہوں۔ یا فی الحقیقت ویسا ہی ہوا ہو۔ بہرحال مرثیہ ختم کرنے کے بعد میر خلیق نے ارباب مجلس کو متوجہ کرکے کہا کہ آپ صاحبوں نے اکثر میرے لڑکے کے سننے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے آج سن لیں۔ یہ کہہ کر میر انیس کو اشارہ کیا وہ نہایت وقار و ادب سے اُٹھے اور میر خلیق ممبر کے دوسرے زینہ پر بیٹھتے تھے یہ اس سے ایک درجہ بلند تیسرے زینہ پر بیٹھ گئے اور اس وقار اور خوبصورتی سے بیٹھے کہ تمام ارباب مجلس کی نگاہوں میں وہ خوبصورت ٹھاٹھ جم گیا اور میر انیس کا خوبصورت چہرہ اور ورزشی بدن اور عنفوانِ شباب کی جوشیلی امنگ مل جل کر ایک غیر معمولی اثر ظاہر کرنے لگی۔ پہلے میر صاحب ممبر پر نقش تصویر ہو کر چند منٹ چُپ بیٹھے رہے۔ پھر ایک رباعی پڑھی پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے ایک غیر معمولی لطف پیدا کیا اور چاروں طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر انیس نے ایک سلام پڑھ کر ساری مجلس کو اپنا گرویدہ کرلیا ازاں بعد مرثیہ شروع کیا تو رزم و بزم کی تصویر اس خوبی اور خوبصورتی سے دکھائی کہ اسی وقت سے ہر دل پر میر صاحب کی فصاحت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اعجاز کلام اور انداز بیان سے کئی مرتبہ ارباب مجلس بیتاب ہوئے اور کئی مرتبہ جوش شجاعت اور انداز فصاحت کے بند سن کر جھومنے لگے۔ قصہ مختصر میر انیس نے پرجوش تعریفوں کی گونجتی ہوئی آوازوں میں مرثیہ ختم کیا۔ سیکڑوں قدر شناس اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر میر انیس سے مصافحہ کرنے اور ہاتھ چومنے کو سامنے آئے اور تعریف کا سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ پھر تو میر صاحب کی شہرت روز بروز بڑھنے لگی اور بڑے بڑے نواب و امیر وزیر میر انیس کے زیب مجلس ہونے پر فخر کرنے لگے اور بہت جلد تمام شہر میں میر انیس میر انیس کی دھوم مچ گئی۔ اور بتدریج تمام ہندوستان میں اُنکا ڈنکا بجنے لگا۔ اور میر انیس کے ساتھ مرزا دبیر کی سخن آرائیاں بھی شہرت پذیر عام ہوئیں اور شہر کے خوش مذاق لوگوں نے

دونوں کو حریف مقابل قرار دے لیا جیسے میدان تغزل میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ایک دوسرے کے حریف مقابل تھے۔

شاہی مجلس

تمام شہر لکھنؤ میں میر انیس اور میرزا دبیر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نقادانِ سخن کے جتھے دونو کی طرفداری میں علاحدہ علاحدہ بٹے ہوئے تھے۔ ہر گروہ اپنے مقتدیٰ کی طرفداری پہ زور دیتا تھا۔ کسی ایک مجلس میں دونوں صاحبوں کا جمع ہونا اتنا مشکل تھا جو بغیر خاص تدبیر اور اثر کے ناممکن تھا لیکن لکھنؤ کے حضرات دونو کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے چنانچہ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جانعالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کر کے ایسی تقریر کی جس سے بادشاہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھنے کا ارشاد فرمائیں اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا اس پہ مفتاح الدولہ خود دونو صاحبو نکی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی پیغام پہنچایا۔ دونو صاحبوں نے قبول کر لیا۔ روز وقت معینہ پہ پہلے میرزا دبیر پہنچے۔ اور باریاب حضوری ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر انیس نے ہر بات کی خبر پہنچنے کا انتظام کر رکھا تھا جب یہ حال معلوم ہوا کہ میرزا دبیر پہنچ گئے تو اپنے جانے میں دیر لگانا شروع کی۔ یہانتک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی۔ اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپکا انتظار ہے میر صاحب تیار تو تھے ہی اور فنس سامنے حاضر تھی اس پہ بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ مجلس میں فرش پہ پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب نہایت تمکنت اور وقار سے سیدھے ممبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدہ مقررہ کے موافق ممبر کے پاس بیٹھ گئے۔ نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو انہیں کہا کہ آپ حضرت جان عالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے

اطلاع کی۔ بادشاہ نے اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار کیا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ
میرانیس نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کا کیسا خیال رکھا ہے آخرکار مجلس شروع ہوئی
پہلے میرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا انہوں نے پڑھا بادشاہ کی تعریف میں بھی ایک رباعی
پڑھی سامعین نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ اور واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازوں سے عالی شان
کمرہ گونجنے لگا۔ تال مجلس بھی حاصل ہوا اُنکے بعد میرانیس کو پڑھنے کا ارشاد ہوا۔ میر صاحب
کچھ لیکر نہ گئے تھے میر مونس سے پوچھا کچھ لائے ہو انہوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا
اُس کو دیکھا اور فی البدیہ ایک مطلع تصنیف کیا اور ممبر پر تشریف لے گئے۔ میر مونس کا
سلام اُس وقت کے مشاعرہ کی طرح پر تھا جس کا ردیف و قافیہ یہ ہے گلستاں ہو کر بیاباں ہو کر
ممبر پر جاکر اپنی عادت کے موافق تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ جب تمام مجلس اُن کی
طرف متوجہ ہوئی تو جناب امیرؑ کی مدح میں ایک رباعی پڑھی۔ چاروں طرف سے آفریں و مرحبا
کا شور بلند ہوا ازاں بعد سلام شروع کیا جس کا وہ فی البدیہ مطلع یہ ہے۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں ادائے کلام کے مزے لینے لگیں اور میرانیس کے
انداز بیان نے تمام درباری لوگوں کو سمجھا دیا کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجہ کمال سے نیچے
اُترنے والے نہیں سلام ختم کرکے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے جس سے اہل مجلس
پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی۔ اور رزم و بزم دونو کا حق ادا کرکے ممبر سے اُترے۔
میر صاحب کے اشارات کو بادشاہ بھی سمجھ گئے جو ممبر کے عقب میں شہ نشین پر تشریف رکھتے
تھے۔ اور نواب مفتاح الدولہ اور حاضرین سے میرانیس کے سلام کے متعلق کہا کہ اس زمین
میں ہم نے بھی سلام لکھا ہے دونوں کا انداز بیان یکساں معلوم ہوتا ہے حاضرین نے کہا
جی پیر و مرشد کیوں نہیں پھر میرانیس کو سامنے یاد فرما کر تعریف کی۔ میر صاحب آداب بجا لاکر

[illegible] تمام [illegible] میں اس مجلس کا شہرہ ہوگیا اور مہینوں اُسکا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے یہ
[illegible] حب کی زبانی سن کر قلمبند کیا۔

مجلس عظیم آباد

میر صاحب عظیم آباد تشریف لیجایا کرتے تھے مگر ایک سال کسی سبب سے نہ جا سکے تو
سال آیندہ کے لئے خاص اہتمام کیا گیا۔ قدر شناس و حوصلہ مند نواب نے کلکتہ۔ بہار۔
مرشد آباد۔ بنارس۔ الہ آباد وغیرہ کو اشتہاری خط روانہ کئے تاکہ انکے سب مشتاق اور
اس فن سے دلچسپی رکھنے والے وقت مقررہ پر تشریف لاکر شریک مجلس ہوں۔ چنانچہ
روز مقررہ پر چاروں طرف سے بڑے بڑے رئیس و امیر اور ارباب علم و کمال میر صاحب کو دیکھنے
اور سننے کے لئے وہاں پہنچ گئے اور تمام شہر عظیم آباد کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ کثرت سے
شریک مجلس ہوئے۔ ہزاروں آدمی کا مجمع تھا۔ اور زیادہ تر ہر فرقہ کے چیدہ اور منتخب لوگ شریک
تھے۔ نو بجے سے مجلس شروع ہوئی۔ سوز خوانی کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک میر مونس نے
مہر پر تحت اللفظ مرثیہ پڑھا۔ کئی مرتبہ اہل مجلس جوش گریہ سے بیتاب نظر آئے کئی مرتبہ رزمیہ
بندوں پر جھومنے لگے۔ بند بند پر واہ واہ کے شور سے عالی شان مکان گونج جاتا تھا اور خیال
کیا جاتا تھا کہ ایک مرثیہ خواں کا جو کمال ہونا چاہیے وہ میر مونس نے ظاہر کر دیا۔ اب اس سے
زیادہ کیا ہوگا۔ اسکے بعد میر انیس کا نمبر آیا تو سب ارباب مجلس زانو بدل بدل کر انکو سننے کے
مشتاق ہوئے۔ اور مجلس نہایت ذی رتبہ اور قابل قدر سامعین سے ایسی بھری ہوئی تھی
کہ بہت کم ایسی مجلس جمع کی جاسکتی ہے اور ایک مرثیہ خواں ایسی مجلس کو اپنی کامیابی کا
بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔ لیکن میر صاحب کی دُھن کو دیکھئے کہ جب میر مونس ممبر سے
اترے اور میر انیس تشریف لے گئے تو ممبر پر تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہنے کے بعد جب ارباب
مجلس آمادہ سماعت ہوئے تو کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ

صاحبو۔ مجلس کو بہت طول ہوگیا۔ اور غالباً آپ سب صاحب میر مونس کو سنکر سیر ہوگئے ہونگے
اور اب فریضۂ ظہر کا وقت آگیا۔ میں نماز پڑھ لینا چاہتا ہوں جسکو جناب سید الشہدا نے تلواروں کی
دھاروں میں ادا فرمایا ہے۔ آپ بھی نماز سے فارغ ہولیں۔ پھر جن صاحبوں کو انیس کا سننا
ہو وہ تشریف لائیں اور جو میر مونس کو سنکر سیر ہوچکے وہ اپنے گھروں میں آرام فرمائیں اس کو
سنکر ایک عام مایوسی کی صورت ظاہر ہوئی۔ اور میر صاحب نماز پڑھنے کو تشریف لیچلے جنکو
دیکھکر تمام ارباب مجلس اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور وہ عالی شان مجمع برخاست ہوگیا۔
بعض صاحبوں کو سخت افسوس ہوا کہ جناب میر صاحب نے ایسی بھری مجلس کو کیسا تربتر
کردیا جواب جمع ہونا دشوار ہوگا۔ لیکن ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ اُن صاحبوں نے پھر
معاودت فرمائی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لیتے آئے جو اس سے پہلے شریک نہ تھے
اس طرح پر وہ مجلس بہ نسبت پیشتر سے زیادہ کھچا کھچ بھر گئی جسکو دیکھکر بانی مجلس بے انتہا
خوش ہورہے تھے جب میر صاحب کو خبر ہوئی کہ مجلس تیار ہے تو خراماں خراماں تشریف
لائے اور ممبر پر جاکر سر اٹھایا اور پیشتر سے زیادہ بھری ہوئی مجلس کو دیکھکر کہا کہ ؟
حضرات۔ مجھکو اس کا اندازہ کرنا مقصود تھا کہ انیس کے دیکھنے والے کتنے ہیں۔ الحمد للہ کہ
آپ صاحبوں نے میری قدردانی کا ثبوت دیا۔ یہ کہکر ساری مجلس کو اپنا گرویدہ کرلیا
اور دو چار رباعیاں اور ایک سلام پڑھکر یہ مرثیہ شروع کیا۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے — جلوہ کیا سحر کے رُخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے — مڑکر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اس مرثیہ کے مسجع بندوں نے سخن شناس طبائع پر جو اثر کیا اُس کا بیان نہیں ہوسکتا
رزمیہ بندوں کے ہر شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کی پرجوش آوازوں سے تمام مکان گونج

رہا تھا۔ اور رنج والم کے جانکاہ بندوں پر دلوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں میر صاحب
نے کئی مرتبہ چاہا کہ اب مرثیہ ختم کریں لیکن ساری مجلس کے اصرار اور بڑے بڑے امرا و
رؤسا کے بیقرار دلوں اور انکی عام خواہشوں نے جبتک پورا مرثیہ ایک ایک بند کرکے
سن نہ لیا انکا ممبر سے اترنا قبول نہ کیا۔ بلکہ اکثر اصحاب مقطع کا بند سنکر مایوس ہوئے کہ
ابھی کیوں یہ مرثیہ ختم ہوگیا۔ اور کیوں میر صاحب کی معجز بیانیوں کے لطف مزید کا موقع باقی نہ رہا

مجلس حیدرآباد

نواب تہور جنگ بہادر نے میر انیس کو طلب فرمایا۔ یہ طلبی درحقیقت نواب سرسالار جنگ
محمد تراب علی خان بہادر مرحوم مدارالمہام سلطنت آصفیہ حیدرآباد کی طرف سے تھی۔ کئی معتبر
لوگوں نے جو اس مجلس میں شریک تھے مجھ سے بیان کیا کہ اس مجلس میں حیدرآباد کے
تمام امرا اور شرفا اور ہر فرقہ اور ہر درجہ اور ہر طبقہ کے ہندو مسلمان سنی شیعہ لوگ شریک
تھے۔ اور عوام کی تو وہ کثرت تھی کہ عالی شان مکان کے دالانوں اور صحن زیر شامیانہ کے
اطراف کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ مل سکتی تھی۔ ہزاروں آدمی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے
تھے۔ اور ایک جم غفیر باہر کھڑا ہوا تھا جس کو اندر جانے کے لئے سانس نہ ملتی تھی اور میر انیس
کو سن کر تمام ارباب مجلس مہینوں انکا ذکر کرتے اور انکے طرز بیان کو یاد کرکے اسکے مزے لیتے
رہے۔ رخصت کے وقت نواب سرسالار جنگ نے سات ہزار اور نواب تہور جنگ نے تین ہزار
روپے پیش کئے۔ اور آمدورفت کا خرچ علحدہ دیا گیا۔ اس مجلس کی شہرت ہونے کے بعد
حیدرآباد کے سب سے زیادہ دولتمند اور سب سے اول درجہ کے امیر نواب سرآسمانجاہ
بہادر نے چاہا کہ اگر میر انیس اپنی ٹوپی کی جگہ حیدرآباد کی منصبداری پگڑی رکھکر مرثیہ پڑھیں
تو میں اُن کو سننا چاہتا ہوں اور پانچہزار روپیہ پیش کیا جائیگا۔ بعض دس ہزار کی تعداد
بیان کرتے ہیں لیکن میر انیس نے اپنی ٹوپی اتار کر حیدرآباد کی پگڑی رکھنا قبول نہ کیا۔

الہ آباد کی مجلس

جب میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے تو روز اور وقت مقررہ پر شریک ہونے کے لئے اشتہار شائع کر دیئے گئے تھے۔ اُس روز سے ایک دن پہلے طلبار کے عام شوق کو دیکھ کر کالج میں ایک روز کی تعطیل منظور کی گئی اور تمام کچہریوں میں اہل عملہ کو شرکت مجلس کی اجازت دی گئی تھی۔ اور قریب قریب ہر فرقہ و مذہب کے اعلیٰ عہدہ داروں نے شریک مجلس ہونے کے لئے اپنے افسران سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ اس لئے مجموعی طور پر اس عالی شان مجلس میں اس کثرت سے آدمی آئے اور ایسے منتخب لوگ شریک ہوئے تھے جو عام تقریبات میں اس سے پہلے ایک جگہ جمع ہوتے نہیں دیکھے گئے۔

شمس العلمار مولوی ذکاءاللہ صاحب سابق پروفیسر عربی کالج الہ آباد بیان کرتے ہیں کہ جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالی شان مکان آدمیوں سے بھر چکا تھا۔ بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے کنارے زمین پر دھوپ میں کھڑے ہوئے محو سماعت تھے۔ جب میں پہنچا تو مرثیہ شروع ہو چکا تھا اور میر مجلس کے اندر جگہ پانا ناممکن تھا۔ اس لئے میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے اور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور اُن کے اداے بیان کو دیکھنے لگا۔ میں میر انیس کی فصاحت بیانی اور اُن کے طرز بیان کی دلفریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سُنا اور نہ کسی کے اداے بیان سے یہ مافوق العادات اثر پیدا ہوتے مشاہدہ کیا۔ میر انیس بوڑھے ہو گئے تھے مگر انکا طرز بیان جوانوں کو مات کرتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ممبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لوگوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے اور جب چاہتی ہے ہنساتی ہے اور جب چاہتی ہے رُلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے

سے تر اور پاؤں خون اُترنے سے شل ہو گئے لیکن میں جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا اور اُن کا مرثیہ سنتا رہا مجکو یہ کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ دلچسپی اور محویت کیا ہوگی

شیش محل لکھنؤ میں میر انیس کی آخری مجلس

میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی۔ چھپن ستاون برس مشق فن میں گزرے۔ جوں جوں وہ بوڑھے ہوتے گئے اُنکی شاعری جوان ہوتی گئی اور زمانے نے اول سے آخر تک اُن کا احترام کیا۔ اُنہوں نے سیکڑوں مجلسیں پڑھیں اور ہمیشہ ارباب مجلس کی واہ واہ اور سبحان اللہ کی پُر جوش آوازوں کی گونج میں منبر سے اُترے۔ کہتے ہیں کہ میر صاحب مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ نے آخری مجلس نواب باقر علی خاں صاحب و نواب جعفر علی خاں صاحب کے شیش محل واقع لکھنؤ میں پڑھی۔ اس کے بعد پھر کسی بڑی مجلس میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس مجلس میں جو مرثیہ آخری مرتبہ پڑھا وہ یہ تھا۔

آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج

رحلت

میر انیس مرحوم نے ایک مہینہ تپ دق کے مرض میں مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو بروز دوشنبہ اپنے مکان واقع چوہدری محلہ میں دنیائے فانی سے رحلت فرمائی مرزا دبیر نے تاریخ کہی:۔

طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

(۳) میر مونس مرحوم کو دیکھا ہے سُنا نہیں۔

(۴) میر انیس مرحوم کو حیدرآباد میں دیکھا اور نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی مجلس میں اُنکی مرثیہ خوانی سے شرف اندوز ہوا ہوں۔

(۵) میر نفیس مرحوم کو وہیں حیدرآباد میں نواب تہور جنگ بہادر کے یہاں اور میر سلیس مرحوم کو نواب بہرام جنگ بہادر کے یہاں زیبِ ممبر دیکھا ہے۔

(۶) میر وحید کو نہیں دیکھا اور نہ اُن کا مرثیہ پڑھنا سُنا۔

(۷) وقت ترتیب کتاب ہذا ۱۳۲۵ھ ہجری میں میر انیس مرحوم کے پوتے دولھا صاحب اور میر صاحب مرحوم کے نواسے میر محمد علی صاحب عارف اور پیارے صاحب رشید یادگار خاندان ہیں میں نے نہیں سُنا مگر سنتا ہوں کہ بہت اچھا کہتے اور پڑھتے ہیں۔ ان میں جناب رشید نواب تہور جنگ بہادر کے یہاں حیدرآباد تشریف لیجاتے ہیں۔ ایک مجلس میں اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر فرمانروائے حیدرآباد بھی تشریف لائے تھے اور جناب رشید کو سُن کر بہت خوش ہوئے۔

(۸) میرزا دبیر مرحوم کے جانشین اُن کے خلف الصدق میرزا اوج سلمہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں یہ صاحب اربعین میں حیدرآباد تشریف لیجاتے ہیں اور نواب فیاض علیخاں صاحب کے آراستہ و پیراستہ عاشور خانہ میں پڑھتے ہیں۔ ایک مجلس میں اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد بنفس نفیس اچانک تشریف لے جا کر شریک ہوئے اور میرزا اوج کا پڑھنا سُن کر بڑی دلچسپی ظاہر فرمائی۔ اور ختم مجلس تک عام طور سے ممبر کے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھے رہے۔ جس سے حضور نظام کے حُسن عقیدت کا پتہ ملتا ہے۔ خدا دیر تک سلامت رکھے۔

میر انیس کا مزار

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے ۔۔۔ رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ لپٹ کے سوؤں اے قبر ۔۔۔ میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

لکھنؤ میں جب اعلیٰ درجے لوگ مرتے ہیں تو ان کی قبر کے لئے تال کٹورے کی کربلا یا اور کسی کربلا اور متبرک مقام میں سیکڑوں روپیہ دیکر زمین لی جاتی ہے۔ خاص لوگوں کے لئے آبادی کے اندر خاص شروط سے متوفی کے دفن کی اجازت ہو جاتی ہے یہ اجازت میونسپلٹی سے حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اسی خصوصیت سے جناب میر انیس اعلے اللہ مقامہ اپنے مکان واقع سبزی منڈی متصل چوک لکھنؤ کے قریب اپنے ہی ایک مکان میں دفن ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا دالان ہے۔ مجکو میر انیس کی مستغنی عن البیان شہرت۔ اور اُن کی ایسی مقبول عام خدمت اور اُن کے قدر شناس امرا اور لکھنؤ کے فیاض اور اپنے شہر کی خودداری کا خیال رکھنے والے ارباب ہمت سے تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے اتنے بڑے شہرۂ آفاق شخص کے لئے کوئی خاص یادگار کا انتظام نہیں کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ آج کل کے قومی طرز عمل سے واقف نہیں۔ اُن کو معلوم نہیں کہ یہ زمانہ ایک ایسے شخص کے مرنیکے بعد اُسکو کن تدبیروں سے زندہ رکھنا چاہتا ہے اور وہ ملک اور قوم کی عام توجہ کا کس قدر مستحق ہوسکتا ہے۔
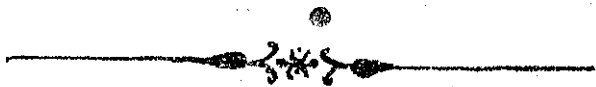
شمس العلماء مولانا آزاد کی رائے و تحقیق

میر ببر علی انیس نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں اپنے باپ کے شاگرد تھے اور جس طرح عمر میں دونوں بھائیوں سے بڑے تھے اسی طرح کمال میں بھی فائق تھے۔ ابتدا میں انہیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی وہاں بڑی تعریف ہوئی شفیق باپ سن کر دل میں تو باغ باغ ہوا مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انہوں نے حال بیان کیا۔ غزل سُنی اور فرمایا کہ بھائی! اب اس غزل کو سلام کرو۔ اور اس شغل میں زورِ طبع کو صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اسی دن سے اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزل مذکور کی طرح میں سلام لکھا۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرے میں آگئے۔ اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی نیک نیتی کی برکت نے اسی میں دین بھی دیا اور دنیا بھی۔ اُس وقت تک یہ اور ان کے ہمعصر اپنے اُستادوں کی اطاعت کو طاعت سمجھتے تھے۔ سلام۔ مرثیے، نوحے، رباعیاں لکھتے تھے، اور مرثیے کی مقدار ۳۵۔۴۰ سے ۵۰ بند تک تھی۔ زمانے کی خاصیت طبعی ہے کہ جب نباتات پرانے ہو جاتے ہیں تو انہیں نکال کر پھینک دیتا ہے نئے پودے لگاتا ہے

میر ضمیر اور میر خلیق کو بڑھاپے کے پلنگ پر بٹھایا۔ میر انیس کو باپ کی جگہ ممبر پر ترقی دی۔ اُدھر سے مرزا دبیر ان کے مقابلہ کے لیے نکلے۔ یہ خاندانی شاعر نہ تھے مگر ضمیر کے شاگردِ رشید تھے۔ جب دونوں نوجوان میدانِ مجالس میں جولانیاں کرنے لگے تو فنِ مذکور کی ترقی کے بادل گرجتے اور برستے اُٹھے اور نئے اختراع اور ایجادوں

سکے بیٹھ برسنے لگے۔ بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر امرا اور غربا تک شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ نوجوانوں کے کمال کو خوش اعتقاد قدردان ملے وہ بزرگوں سے شمار میں زیادہ اور وزن میں بہت بھاری تھے۔ کلام نے وہ قدر پیدا کی کہ اس سے زیادہ بہشت ہی میں ہو تو ہو!

قدردانی بھی فقط زبانی تعریف اور تعظیم و تکریم میں ختم نہ ہو جاتی تھی۔ بلکہ نقد و جنس کے گراں بہا انعام تحائف اور نذرانوں کے رنگ میں پیش ہوتے تھے۔ ان ترغیبوں کی بدولت فکروں کی پرواز اور ذہنوں کی رسائی امید سے زیادہ بڑھ گئی!

دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں! اور ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون اور ہر قسم کے خیال۔ ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلا دیں۔ چاہیں ہنسا دیں، چاہیں تو حیرت کی مورت بنا کر بٹھا دیں۔

یہ دعوے بالکل درست تھے، کیونکہ مشاہدہ اُن کی تصدیق کو ہر وقت حاضر رہتا تھا دلیل کی حاجت نہ تھی۔ سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اُس میں چند میدانِ جنگ ہیں، رزم زنگبار، جنگ دارا، جنگ روس، جنگ فور، جنگ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن ہیں، شاہنامہ میں ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی کے ہیں۔ اُنہوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے، ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیے کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا اور اس پہ کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام غریباں کی اداسی، کبھی رات کا سناٹا کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ دکھایا ہے۔ غرض

جس حالت کو لیا ہے اُس کا سماں باندھ دیا ہے، آمد مضامین کی بھی انتہا نہ رہی -
جن مرثیوں کے بند چالیس پچاس سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ (۱۵۰) سے گذر کر ۲۰۰
سے بھی نکل گئے - میر انیس مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا - اور سلاموں
کا تو کیا شمار ہے - رباعیاں تو انکی باتیں تھیں -

دونوں اُستادوں کے ساتھ طرف داروں کے دو جتھے ہو گئے - ایک انیسیئے کہلاتی
تھے دوسرے دبیریئے - اگرچہ ان کے فضول فخریوں اور اعتراضوں نے بیجا تکراریں
اور جھگڑے پیدا کئے مگر بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہوا - کیونکہ بیجا تعریفوں
نے دونوں اُستادوں کی فکروں کو شوق ایجاد اور مشق پرواز میں عرش الٰہی سے بھی
اونچا اُچھال دیا ؏

دونوں اُمتیں جو اپنے دعووں پر دلیلیں پیش کرتی تھیں کوئی وزن میں زیادہ ہوتی
تھی کوئی مساحت میں، اس لئے یک طرفی فیصلہ نہ ہوتا تھا -

انیسی اُمت اپنے سخن آفریں کی صفائی کلام، حُسنِ بیان اور لطافتِ محاورہ
پیش کر کے نظیر کی طلبگار ہوتی تھی -

دبیری امت شوکتِ الفاظ بلند پروازی اور تازگیِ مضامین کو مقابلہ میں حاضر
کرتی تھی -

انیسی اُمت کہتی تھی کہ جسے تم فخر کا سرمایہ سمجھتے ہو یہ باتیں دربارِ فصاحت میں
نامقبول ہو کر خارج ہو چکی ہیں ؏ کہ فقط کوہ کندن و کاہ بر آوردن ہے -

دبیری امت کہتی تھی کہ تم اسے دشواری کہتے ہو، یہ علم کے جوہر ہیں - اسی بلاغت
کہتے ہیں - تمہارے سخن آفریں کے بازوؤں میں علم کی طاقت ہو تو پہاڑوں
کو چیرے اور یہ جواہر نکالے ؏ انیس کے کلام میں ہی کیا ؟ فقط زبانی باتوں کا
جمع خرچ ہے -

انیسؔ اُمت اس جواب پر چپک اٹھتی تھی اور کہتی تھی، کونسا خیال تمہارے سخن آفریں کا ہے جو ہمارے معنی آفریں کے ہاں نہیں ہے؟ تم نہیں جانتے؟ جیسے باتوں کا جمع خرچ کرتے ہو یہ صفائی کلام اور قدرتِ بیان کی خوبی ہے!! اسے سہل ممتنع کہتے ہیں؟ یہ ایک جوہر خداداد ہے۔ کتابیں پڑھنے اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتا۔

دبیرؔیئے اس تقریر کو سن کر کسی مرثیے کی تمہید یا میدان کی آمد یا رجز خوانی کے بند پڑھنے شروع دیتے۔ جن میں اکثر آیتوں یا حدیثوں کے فقرے تضمین ہوتے تھے۔

انیسیئے کہتے تھے، اس سے کس کافر کو انکار ہے، مگر اتنا ہی پڑھیئے گا۔ آگے نہ پڑھیئے گا۔ ورنہ ربط بھی نصیب نہ ہوگا۔ حضرت فقط الفاظ کی دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا اداے مطلب اصل شے ہے، اس پر گفتگو کیجیئے گا تو پوری بات بھی نہ ہوسکے گی، یہ قادر الکلام باکمالوں کا کام ہے، جن کو اس فن کے اصول بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچے ہیں وہی اس کام کو جانتے ہیں۔

دبیریئے اس کے جواب میں اپنے سخن آفریں کی آمد طبیعت، مضامین کا وفور، لفظوں کی بہتات دکھاتے تھے۔ اور جا دیجا کہتے جاتے تھے کہ دیکھیے کیا محاورہ ہے دیکھیے کیا صاف بول چال ہے۔ کس کا منہ ہے جو رات کو بیٹھے اور سو بند کہہ کر اُٹھے۔ برس دن تک خامہ فرسائی کی اور محرم پہ دس پندرہ مرثیے لکھ کر تیار کئے وہ بھی اور دو بھائیوں کے مشورے سے ملا کر۔ اور مباحثوں کے پسینے بہا کر۔

انیسیئے کہتے تھے درست ہے جو رات بھر میں سو بند کہتے ہیں وہ بے ربط اور بے اصول ہی ہوتے ہیں اور جب اداے مطلب پر آتے ہیں تو اتنے بھی نہیں رہتے۔ ساتھ ہی اس کے بعض مصرعے پڑھ دیتے تھے جن پر بے محاورہ ہونے کا اعتراض ہوتا تھا، یا تشبیہیں ناقص ہوتی تھیں، یا استعارے بے ڈھنگے ہوتے تھے۔

اعتراضوں کی ردوبدل یہانتک ہوتی تھی کہ دبیریئے کہتے تھے کہ جو قبولیت خدا نے ہمارے سخن آفریں کو عطا کی ہے کب کسی کو نصیب ہوتی ہے جس مجلس میں انکا کلام پڑھا گیا کہرام ہوگیا۔

انیسئے کہتے تھے وہ کیا پڑھیں گے، انکی آواز تو دیکھئے، انہیں مرثیہ پڑھنا تو آتا ہی نہیں۔

غرض جھگڑالو دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نکرسکتی تھی، تب منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی ؎ دونوں اچھے ؎ دونوں اچھے۔ کبھی کہتی وہ آفتاب ہیں یہ ماہتاب۔ کبھی کہتی یہ آفتاب ہیں وہ ماہتاب۔

لکھنؤ کے بیفکرے لڑانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور تماشے کے عاشق۔ دبیر تو غیر تھے۔ بھائی کو بھائی (انیس و مونس) سے لڑوا دیا۔ میر انیس کے پاس آتے تو کہتے کہ جب تک حضور کے اصطلاحی مرثیے ہیں پڑھے جائیں، جس دن آپ کا بن دیکھا مرثیہ پڑھا قلعی کھل جائے گی، دوسرے بھائی سے کہتے عمر کی بزرگی اور شے ہے، یہ نعمت آپ کا حصہ ہے۔

الغرض یہ پاک روحیں جن کی بدولت ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی صلہ انکا سخن آفریں عطا کرے۔ ہمارے شکریہ کی کیا بساط ہے۔

تباہی لکھنؤ کے بعد ان دونوں استادوں کو باہر جانے کی ضرورت پیش آئی ۱۸۵۸ء میں میرزا دبیر عظیم آباد بلائے گئے وہ گئے۔ پھر ہمیشہ الہ آباد اور بنارس جاتے رہے اسی طرح میر انیس مرحوم اول ۱۸۵۹ء میں نواب قاسم علی خاں کے طلب اور اصرار سے عظیم آباد کو تشریف لے گئے۔ پھر وہاں جانے کا دستور ہوگیا۔ ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ بہادر نے حیدرآباد میں طلب فرمایا۔ اہل حیدرآباد نے ان کے کمال کی ایسی قدر کی جیسی کہ چاہیے۔ مجلسوں میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ عالی شان مکان کی

وسعت بھی جگہ نہ دے سکتی تھی۔

میر انیس کے گھرانے کی زبان اردوئے معلی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں مستند تھی۔ اور انہیں بھی اس بات کا خیال تھا حسنِ اخلاق گفتگو میں انکی تقریر کو اتنا بچائے ہوئے لیےچلتا تھا کہ باتیں حدِ اعتدال سے بھی نیچے ہی نیچے رہتی تھیں۔ اس پر ایک ایک لفظ کانٹے کی تول کسی جگہ اپنا کلام سناتے تو بعض محاورہ پر اتنا کہہ اٹھتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔

جس طرح ان کا کلام لاجواب دیکھتے ہو۔ اسی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثال تھا۔ ان کی آواز۔ ان کا قد و قامت انکی صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک موزوں واقع ہوئی تھی۔ انکا اور اُنکے بھائیوں کا یہی قاعدہ تھا کہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ وضع حرکات۔ سکنات اور بات بات کو دیکھتے تھے اور آپ اُس کی موزونی پر خیال کرتے تھے۔

۱۲۹۱ سنہ ہجری میں رحلت فرمائی۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

میر انیس کے حریف مقابل

میرزا دبیر

میرزا سلامت علی دبیر خاندانی شاعر نہ تھے۔ میرزا غلام حسین عرف میرزا آغا جان کے لڑکے تھے۔ میرزا دبیر نے لڑکپن میں مرثیہ گوئی کا شوق کیا۔ اس شوق نے ممبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر دکھایا

تمام عمر مرثیہ گوئی سے سروکار رہا۔ اور اس فن کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہوگیا۔ ان کی سلامت روی، پرہیزگاری، مسافر نوازی، سخاوت اور فروتنی نے صفت کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔

لکھنؤ میں لڑنیوالے غضب کے تھے۔ مرزا صاحب کا عالم شباب تھا۔ اور کمال بھی عین شباب پر تھا کہ جوانی کا بڑھاپے سے معرکہ ہوا۔ نواب شرف الدولہ میر ضمیر کے بڑے قدردان تھے۔ اُن سے ہزاروں روپے سے سلوک کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں اول مرزا بعد اُن کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے۔ لیکن ایک مجلس میں بے لطفی ہوگئی آخرکار میر ضمیر نے میرزا دبیر کے شہرۂ کمال کو دیکھ کر اُن کے نکتہ مقابل بیٹھنے سے پرہیز کیا۔ اور ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہوگیا۔ زمانے نے اپنے قاعدے کے بموجب چند روز مقابلوں سے شاگرد کا دل بڑھایا اور آخرکار بڑھاپے کی سفارش سے اُستاد کو آرام کی اجازت دی۔ وہ اپنے حریف میر خلیق کے سامنے گوشۂ عزلت کا مقابلہ کرنے لگے۔ اور یہاں "میر انیس اور میرزا دبیر" کے معرکے گرم ہوگئے۔

دونوں کے کمال نے سخن شناسوں کے ہجوم کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ آدھے انیسیے ہوگئے آدھے دبیریے۔ ان کے کلام میں محاکمہ کرنے کا لطف جب ہے کہ ہر اُستاد کے چار چار پانچ پانچ سو مرثیے سجائے خود پڑھو۔ اور پھر مجلسوں میں سُن کر دیکھو کہ ہر ایک کا کلام اہل مجلس پر کس قدر کامیاب ہوا یا ناکام رہا۔ بے اسکے مزا نہیں۔ میر انیس صفائی کلام لطف زبان چاشنی محاورہ۔ خوبی بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے۔ مگر میرزا دبیر بھی شوکت الفاظ مضامین کی آمد اس میں جابجا غم انگیز اشارے درد خیز کنائے دل گداز انداز کے جو مرثیے کی اصلی غرض ہے بادشاہ تھے۔ یہ اعتراض حریفوں کا درست ہے کہ بعض ضعیف روایتیں نظم کر گئے لیکن انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدنظر رکھ کر اُس پر متوجہ ہوتا ہے

تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ انہیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا جہاں ہزاروں آدمی دوست دشمن جمع ہوتے تھے۔ تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطف سخن اور ایجاد مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رلانا اور سب کے منہ سے تحسین کا نکالنا اس شوق کے جذبہ اور فکر ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں نکتہ چینی ایک چھوٹی سی بات ہے جہاں چاہا دو حرف لکھ دیئے۔ جب انسان تمام عمر اس میں کھپا دے تب معلوم ہوتا ہے کہ کتنا کہا اور کیسا کہا۔ میرزا صاحب نے ۲۹ محرم ۱۲۹۱ھ کو بہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس مدت میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ انکے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا نہ اب ویسا زمانہ آئے گا نہ ایسے صاحب کمال پیدا ہوں گے۔

شمس العلماء مولانا حالی کی رائے

زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو مرثیہ کہتے ہیں عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثئے ایسے سچے اور صحیح حالات و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُن سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی۔

ہمارے شعراء نے مرثیہ میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے۔ مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر جناب سید الشہداء کے مرثئے پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثئے کی ابتدا اول اُسی اصول پر ہوئی تھی۔ یعنی میت کو یاد کر کے حزن و ملال کا اظہار کرنا۔ چنانچہ جو مرثئے اول اول لکھے گئے وہ کم و بیش بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے اور اُن میں مرثیت یا بین کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا

مگر چونکہ مرثیہ ایک خاص مضمون کے دائرہ میں محدود تھا اور اُس کی قدر روز بروز زیادہ
ہوتی جاتی تھی۔ لہذا متاخرین کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدت پیدا کریں
اور اس کے مضامین میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ
اُردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہئے
تھی اُس میں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح، فخر و مباہات، رزم اور بزم بھی نہایت
شدومد کے ساتھ شامل ہو گئی جس نے اُردو شاعری میں بہت وسعت پیدا کر دی
پہلے جہانتک ہم کو معلوم ہے میرضمیر[۱] نے ایسے مرثئے لکھے ہیں گویا وہی اس طرز
کے موجد ہیں مگر میر انیس نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری
اور مرثیہ گوئی اُن کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ اس پر اُردو زبان کے مالک تھے۔ اور
لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا اور اُردو شاعری میں جو کہ ماء راکد
کی طرح مدت سے بےحس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔ انہوں نے بیان
کرنیکے نئے نئے اسلوب اُردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیئے۔ ایک ایک واقعہ
کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف
کر دیا اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جس کو ہمارے شاعروں کی قلم نے مس تک نہیں کیا
تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اُس کو شعراء سے روشناس کرا دیا۔
آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اُس نے
اور شعراء سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں اگر ہم
اسی کو معیار کمال قرار دیں تو بھی "میر انیس" کو اُردو شعراء میں سب سے برتر ماننا پڑے گا اس
خاص طرز کے مرثیوں کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک
اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف انہیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے

[۱] میر ضمیر استاد میرزا دبیر ۱۲

بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیوں میں بیان کئے ہیں اُن کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔ امام حسین کے تمام حالات شجاعت سخاوت عفت۔ عدالت کا سب سے زیادہ روشن اور مکمل نمونہ ہیں جو حُسن اخلاق کا موضوع حقیقی ہے۔ باقی تمام اخلاق انہیں چار اصول کے فروع ہیں جو سب کے سب ان چار کے تحت میں دیکھے اور دکھلائے جا سکتے ہیں۔

جناب شمس العلماء مولوی امداد امام صاحب اثرؔ

رئیس عظیم آباد کی رائے

اُردو کی موجودہ شاعری فارسی کی شاعری کے ساتھ بہت مشابہت رکھتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اُردو کے شعراء فارسی کے شعرا کی ہمیشہ تبعیت کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ تقاضائے ملک یہ تھا کہ اُردو کی شاعری سنسکرت کی شاعری کا انداز پیدا کرتی۔ ایسی صورت میں اُردو کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا۔ مگر اس عدم تتبع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُردو کے شعراء زبانِ سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور چونکہ عموماً صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے اسی لئے اسی زبان کی تبعیت کی۔ کاش شعرائے اُردو سنسکرت کی شاعری سے مطلع ہو کر اُس کا چربا اُتارتے تو اصناف شاعری میں اُردو کا درجہ بڑھ جاتا مثلاً ڈرامانگاری جو فارسی میں نہیں اُردو میں داخل ہو جاتی۔ اور ڈرامانگاری کے داخل ہو جانے سے اُردو کی شاعری بلاشبہ ممتاز تر ہو جاتی۔ فارسی کی طرح عربی میں بھی رامائن جیسی مبسوط کتابیں

نہیں اس لئے عربی کو بھی اس بحث سے خارج سمجھنا چاہیئے۔

بہرحال اردو کی موجودہ شاعری کی حالت یہ ہے کہ اگر میر انیس کو شعرائے اُردو کے زمرہ سے نکال لیجئے تو اردو کی شاعری فارسی کی شاعری سے بہت پیچھے رہجاتی ہے یہ جناب غفراں مآب کا کمال ہے کہ جس کے باعث اردو کی شاعری نہ صرف فارسی کی شاعری سے اعلیٰ دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے ارفع پائی جاتی ہے۔ لاریب حضرت کی مرثیہ نگاری نے رزمی شاعری کا وہ عالم دکھایا ہے کہ جس کے مشاہدے سے عقل دنگ ہوجاتی ہے۔ گو حضرت نے کوئی کتاب، رامائن، رمہابھارت، ایلیڈ، انیڈ، شاہنامہ، یا پیریڈایزلاسٹ کے طور کی منظوم نہیں فرمائی تو بھی رزمیہ شاعری کا جواب فردوسی والمیکی اور بیاس کی تصنیفوں کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔

امداد امام

شمس العلماء علامہ شبلی کی رائے کا اقتباس

از کتاب موازنۂ انیس و دبیر

عرب میں سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثئے سے ہوئی۔ اسکے بعد شاعری اصلی حالت سے نکل کر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ خود بخود زوال پذیر ہوگیا کیونکہ قصائد کی طرح اس سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا۔ اسی زمانہ میں کربلا کا واقعہ پیش کیا اس وقت میں اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثئے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی مگر زمانہ نے بنو امیہ اور بنی العباس کی سلطنت میں اس رنگ کو ابھرنے نہ دیا۔

فارسی شاعری کی بنیاد تکلف آورد اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لئے شاعری کے وہ جذبات جن کو شاعری سے خاص تعلق تھا پستی کی حالت میں آگئے۔ فردوسی نے سہراب کا مرثیہ جو اُس کی ماں کی زبان سے لکھا تھا اُسکے اشعار سے اسکا اندازہ ہوسکتا ہے۔

بمادر خبر شد کہ سہراب گرد | ز تیغ پدر خستہ گشت و بمرد
خروشید و جوشید و جامہ درید | بزاری بر آں کودک نارسید
بزو چنگ و بدرید پیراہنش | درخشاں شد آں لعل زیبا تنش

اسی زمانہ کے قریب سلطان محمود کی وفات پر فرخی نے مرثیہ لکھا جو گیارہ شعر کا ہے اس کے بعد مرثئے بہت کم لکھے گئے۔ البتہ شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دو مرثئے مشہور ہیں لیکن چونکہ اس زمانہ میں عیش و طرب کی مجلسیں غزل کے ترانوں سے گونج رہی تھیں اس لئے اس کا اثر عام نہ ہوا جب صفویہ اور تیموریہ کا زمانہ آیا تو اس دور میں محتشم کاشی نے آٹھ دس بند کا ایک مرثیہ لکھا جس کا جواب آجتک نہ ہوسکا لیکن تمام ملک میں قصیدہ اور مدح کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا کہ عام شعرا پر اس کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ طالب آملی۔ غزالی میلی سلیم کلیم وغیرہ شعرائے متاخرین کے کلام میں اور سب اصناف سخن پائے جاتے ہیں لیکن مرثیہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے قدسی نے اپنے جوان بیٹے کا مرثیہ لکھا لیکن نو یا دہ رسالت کے غم میں دو شعر بھی نہ لکھے ظہوری نے مرثئے لکھے لیکن وہ اپنا جوش نہ تھا بلکہ عادل شاہ کے مذاق کی خوشامد تھی۔ پھر محتشم کی طرح "مقبل" نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی مقبل کے بعد ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہوگیا۔ اور مرثئے کے اور بہت سے اقسام پیدا ہوگئے مثلاً نوحہ پیش خوانی وغیرہ۔

ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولی سے ہوئی لیکن اُنکے کلام میں مرثیہ کا پتا نہیں چلتا ہاں سودا و میر سے پہلے مرثئے کے رواج کا پتہ ملتا ہے میر تقی نے بھی برائے نام مرثیہ لکھا ہے۔ اس وقت تک مرثئے عموماً چو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ سودا نے مسدس

لکھا۔ میر ضاحک اور میر حسن نے بھی مرثیے لکھے ہیں جواب نہیں ملتے۔

سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر میرزا دبیر کے اُستاد ہیں۔ اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا۔ غالباً پہلا شخص جس نے ممبر پہ بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھا وہ میر ضمیر تھے۔ نئی تشبیہیں نئے استعارے پسندیدہ مبالغہ واقعہ نگاری مناظر قدرت کی تصویر وغیرہ تمام محاسن کلام میر ضمیر کے ہاں پائے جاتے ہیں مگر اُن کے ہاں ان کا رنگ ہلکا سا تھا میر انیس اور میرزا دبیر نے اُس کو زیادہ شوخ کر دیا۔

مرزا دبیر میر ضمیر کے شاگرد تھے اور میر انیس نے اپنے باپ میر خلیق سے مشق فن کی ہے۔ میر انیس نے شاعری میراث میں پائی تھی اور مرثیہ گوئی خاندانی ورثہ تھا جیسا کہ فرماتے ہیں ع

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس اور اُن کے حریف مقابل میرزا دبیر کے کلام سے یہ پتہ نہیں ملتا کہ کون مرثیہ یا سلام کس نے پہلے لکھا ہے اس سے یہ تعین نہیں ہوتا کہ فلاں باب میں ایجاد کا فخر کس کو ہے۔

میر انیس کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا ہے لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعویٰ ہے کہ ان مرثیوں میں بہت کچھ تحریف اور خلط ہے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے ایک رسالہ میرزا دبیر اور میر مونس کے اغلاط کے متعلق لکھا تھا اُس کا جواب میرزا محمد رضا متخلص بہ معجز شاگرد ناسخ نے لکھا جس کا نام تطہیر الاوساخ ہے اور ۱۲۹۶ھ میں مطبع شعلہ کانپور میں چھپا تھا۔

میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی انکی ابتدائے مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ کثرت سے متداول تھے اور شعراء بے تکلف استعمال کرتے تھے اس قسم کے

الفاظ میرانیس کے ہاں بھی ابتدائی کلام میں پائے جاتے ہیں پھر جس قدر زمانہ گذرتا گیا میر صاحب اُن الفاظ اور تراکیب کو چھوڑتے گئے۔

میرانیس نے ہر مقام پر جزئیات بلاغت کا خیال رکھا ہے، بچے، جوان، بوڑھے، بی بی، باندی، امام، اعزا، اعوان، انصار اور فرقہ مخالف کے مبارز اور پہلوانوں کے متعلق ہر درجہ اور ہر شخص کے مناسب حال دادِ کمال دی ہے۔ اور مکمل طور سے جزئیات بلاغت کی توضیح کی ہے۔ پھر تشبیہات اور استعارات کی خوبیاں بجائے خود قابلِ دید ہیں۔ جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی مثیل تصویریں کھینچی ہیں واقعہ نگاری کی ترتیب اور سلسلہ بندی میں وہ قابل قدر کمال صرف کیا ہے جو اُردو میں میرانیس کا حصہ ہے روزمرہ کی صفائی تو میرانیس کے گھر کی چیز ہے اُس سے بہتر اور کہیں نہیں ملتی۔ میر صاحب کا کلام ابتذال سے پاک ہے۔ میرانیس نے بعض غلط واقعات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے جس سے سب کو واقعیت کا دھوکا ہوا اور اب وہ بطور ایک واقعہ مسلمہ کے تمام مرثیہ گویوں کے ہاں مانے جانے لگے۔

رزمیہ شاعری میں عربی شاعری شاہنامہ فردوسی کی نظیر نہیں پیش کر سکتی یہ تو بڑی بات ہے عربی میں کوئی مسلسل رزمیہ نظم پچاس شعروں کی بھی نہیں مل سکتی۔ فردوسی کا یہ بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات، داؤں پیچ، فنون جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا لڑائی کے ہر قسم کے کرتب نہیں دکھاتا لیکن میرانیس لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اُسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

میرزا دبیر اُنکے حریف مقابل مانے جاتے ہیں لیکن میرانیس کی فصاحت میرزا دبیر کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔ بندش میں تعقید اور اغلاق اور تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار نظر آتے ہیں بلاغت نام کو نہیں کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے

وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اُس کو سنبھال نہیں سکتے اس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ اُنکے کلام میں یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ نہایت پُرگو تھے اُنکے اشعار کا شمار لاکھوں تک ہے اور اخیر اخیر میں وہ میرانیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے۔ اس بنا پر اُنکے کلام میں جابجا شاعری کے لوازم پائے جاتے ہیں لیکن میرانیس کے مقابلہ میں وہ بہت کم ہیں۔ اسی طرح میرانیس کے محاسن شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔

مجاز، تشبیہ، استعارہ، تمثیل

یہ چیزیں حُسنِ کلام کا زیور ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو کچھ جادو گری ہے وہ انہیں کی بدولت ہے۔ ایک جاہل سے جاہل شخص بھی جب اپنے کلام میں تاثیر پیدا کرنا چاہتا ہے یا کسی خاص جوش کی حالت میں اسکی زبان سے بے اختیار اثر پیدا کرنے والے الفاظ نکلتے ہیں تو اسلوب کلام میں خود بخود مجاز، تشبیہ، استعارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک عامی بھی جب غصہ میں آتا ہے تو حریف سے کہتا ہے کہ " میں تجھکو مسل ڈالونگا تیرے پرخچے اڑا دونگا" غم کی حالت میں کہتا ہے " چھاتی پھٹ گئی، دل میں داغ پڑ گئے کلیجہ چھِد گیا، یہ تمام استعارات ہیں جو بے اختیار زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اور جن سے کلام کی تاثیر دوچند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے۔

---

۵۱ میرانیس اور میرزا دبیر کے مقابلہ کی بحث ان چند سطروں پر تمام نہیں ہو سکتی اُس کے لئے دونوں صاحبوں کے مجامیع تصنیفات پر نظر کرنا اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھنا اور دکھلانا ہوگا جس کے لئے مہینوں کی فرصت درکار ہے۔ اس لئے میں اس مقام پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(اشہری)

اسی بنا پر شعر کی حسن و خوبی کا بڑا معیار یہ ہے کہ اس میں موقع بموقع تشبیہات و استعارات پائے جاتے ہیں لیکن جس طرح ہر چیز جب تک نیچرل حالت میں رہتی ہے اس کا اصلی حسن قایم رہتا ہے، جب تکلف اور تصنع شروع ہوتا ہے تو اثر میں کمی آجاتی ہے اسی طرح تشبیہہ اور استعارہ میں بھی جب بہ قصد و تکلف، غرابت اور غیر معتدل ضرورت پیدا کی جاتی ہے تو اصلی اثر جاتا رہتا ہے۔

اردو کی شاعری میں جس طرح اور بہت سے بے معنی تکلفات پیدا ہوگئے ہیں جنہوں نے شاعری کا اصلی جوہر خاک میں ملا دیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی بھی حالت بدل گئی ہے اور طرہ یہ کہ آج کل کے اہل سخن بدمذاقی سے اسی کو کمال سخن سمجھتے ہیں۔ اس پر پہلے ہم کو مختصر طور پر ان چیزوں کی حقیقت بتانی چاہیے اور یہ دکھلانا چاہیے کہ تشبیہہ اور استعارہ سے کلام میں کیوں حسن پیدا ہوتا ہے۔

مجاز، تشبیہہ، استعارہ۔ درحقیقت ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں "زید شیر ہے" مجازی "، "زید شیر کے مشابہ ہے" تشبیہہ ہے، "شیر آرہا ہے" جب مراد یہ ہو کہ زید آرہا ہے استعارہ ہے۔

ان سب چیزوں میں قدر مشترک اور ان قالبوں کی روح "تشبیہہ" ہے، "زید شیر ہے" اسکے یہ معنی ہیں کہ زید شجاعت اور دلیری میں شیر کی مشابہ ہے، "شیر آرہا ہے" اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ایسا شخص آرہا ہے جو شجاعت اور دلیری میں شیر کے مثل ہے تشبیہہ اور استعارہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہہ کی حالت میں متکلم یہ تسلیم کرتا ہے کہ زید آدمی ہے لیکن دعویٰ یہ کرتا ہے کہ وہ باوجود آدمی ہونے کے شجاعت میں شیر کے برابر ہے۔ برخلاف اس کے استعارہ میں وہ زید کو بالکل شیر فرض کر لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ زید آدمی ہے اور شیر کے برابر ہے، بلکہ کہتا ہے کہ زید آدمی ہی نہیں، تم جس کو آدمی سمجھتے ہو وہ آدمی نہیں بلکہ شیر ہے۔ اس بنا پر استعارہ وہ ہے کہ مشبہ کا نام نہ آئے صرف مشبہ کا ذکر

ہو مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ میدانِ جنگ میں رستم آیا تو کہا جائے کہ میدان میں شیر آیا" استعارہ میں زیادہ لطف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مشبہ بہ کے لوازم اور خصوصیات بھی اُسکے ساتھ ذکر کئے جائیں مثلاً میر انیس حضرت عباسؓ کی شان میں کہتے ہیں۔ ع

نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

ڈکارنا ضیغم کے خصوصیات میں سے ہے۔

استعارہ وہاں اور بھی لطیف اور نازک ہوجاتا ہے جب مشبہ بہ کا بھی ذکر نہ کیا جائے بلکہ صرف اُسکے لوازم ذکر کئے جائیں مثلاً جب کبھی بہادر شخص کے غصہ کی حالت بیان کرنی ہو تو کہا جائے کہ وہ بپھرا ہوا کھڑا ہے۔ بپھرنا شیر کے غصہ کو کہتے ہیں۔ یہاں شیر کا نام نہیں لیا گیا بلکہ جو لفظ شیر کے لئے مخصوص ہے اُس سے بہادر کے غصہ کی تعبیر کی گئی ہے اس صورت میں لطف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ متکلم گویا یہ فرض کرتا ہے کہ اس بہادر کا شیر ہونا ایک قطعی اور مسلم الثبوت امر ہے، اس لئے اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ شیر ہے۔ اور جب یہ مسلم ہے کہ وہ شیر ہے تو اُس کے افعال و حرکات کی تعبیر کی جاتی ہے۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ مجاز، استعارہ، تشبیہ، سب کا اصلی جوہر تشبیہ ہے تو اس پر غور کرنا چاہئے کہ فطرۃً تشبیہ سے کیوں طبیعت پر اثر پڑتا ہے۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ انسان میں فطرۃً یہ بات پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اشیاء کے تصور سے لطف اُٹھاتا ہے۔ ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہوگی لیکن اگر کوئی ہوبہو تصویر کھینچ دے تو ہم کو لطف آئیگا اور جس قدر اصل کے مطابق ہوگی اُسقدر طبیعت پر لطف اور استعجاب کا اثر زیادہ ہوگا۔ چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے اسلئے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطرتی امر ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں، مفرد، مرکب، مفرد جس طرح چہرہ کو پھول سے تشبیہ دی جائے

اور مرکب جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اٹھی تو اس میں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں جس طرح شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں۔

مفرد تشبیہ میں چنداں جدت نہیں ہو سکتی۔ اولاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہو سکتا ہے، ثانیاً مدت سے شعراء اور اہل قلم تشبیہ سے کام لے رہے ہیں۔ اس لئے عالم قدرت میں جو چیزیں تشبیہ کے قابل تھیں اکثر کام میں آ چکیں مثلاً چہرہ کو پھول، آفتاب، ماہتاب، آئینہ سے تشبیہ دے سکتے تھے سو سو دفعہ دے چکے اب عالم میں کوئی نئی چیز پیدا ہو تو تشبیہ میں بھی جدت پیدا ہو۔

البتہ مرکب تشبیہ میں ہر وقت جدت پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اول تو ترکیب کی ہزاروں شکلیں ہیں دوسرے یہ کہ چند اشیاء کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کے طرف ہر شخص کا خیال نہیں منتقل ہو سکتا۔

ایک نکتہ اور سمجھ لینے کے قابل ہے کہ تشبیہ کی اصلی خوبی یہی ہے کہ مشبہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور نیچرل شاعری میں جیسا کہ قدمائے عرب کی شاعری تھی تمام تشبیہیں اسی قسم کی ہوتی تھیں لیکن ایک مدت سے ایشیائی شاعری نیچرل حالت سے بہت ہٹ گئی ہے اس لئے آج اس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈنا بالکل بے فائدہ ہے۔ تاہم تشبیہ کی خوبیاں، میر انیس کے کلام میں جس قدر پائی جاتی ہیں اردو زبان میں انکی نظیر نہیں مل سکتی، میر انیس کی تشبیہات میں جو خصوصیات ہیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) اکثر تشبیہات مرکب ہیں۔

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں۔ اور یہی تشبیہ کا بڑا کمال ہے۔

(۳) علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کسی مشبہ کی رفعت اور حسن

اور کبھی تحقیر اور ذلت۔ اور کبھی رعب اور ہیبت ہوتی ہے۔ یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال درجہ پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت عباسؑ پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں تو اس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ۵

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

برچھیوں سے زخمی ہونا چونکہ شکست اور مغلوبیت کی حالت تھی۔ اسلئے اسکے بیان کرنے سے ذلت کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن اس تشبیہ نے حالت بدل دی۔ یا مثلاً جب حضرت عباس کے دونوں ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑے اور اُنہوں نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا تو اس طرح ادا کیا ہے ۶

مشکیزہ تھا کہ شیر کے مُنہ میں شکار تھا

یا مثلاً جب تمام اہل بیت ایک ہی رسی میں قید کئے گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح ادا کیا ہے ۵

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

رسی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسی میں، بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی لیکن اس تشبیہ نے بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا۔

یا مثلاً یہ شعر ۵

مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر ... پروانے گر رہے تھے چراغِ حسینؑ پر

یا مثلاً ان اشعار میں۔

کٹتی تھی یہ زرہ بدنِ بد خصال میں ... پکڑا ہے فیل مست کو مکڑے کے جال میں
۶ گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

ے

سینے کے تھے کواڑ کہ خیبر کے بند باب تنور گرم تھا شکم خانماں خراب
مثلِ تنور مُنہ سے نکلنے لگا بخار

ہیبت اور بدنمائی کی تصویر کھینچدی ہے۔

(۴) محسوسات سے جو تشبیہ دیجاتی ہے نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں اس لئے اُن کے ذکر کے ساتھ فوراً انکی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اس لئے مشبہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے، اسی قسم کی تشبیہات میرانیس کے ہاں کثرت سے ہیں مثلاً بھاگڑ، اضطراب کا بیان۔

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

تلوار کی تعریف ے

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکر اوج سے پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں ے

دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

اسی حالت کی ایک اور تشبیہ

شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

تعزیہ خانے میں لوگوں کا سیاہ ماتمی لباس ے

مردم سیاہ پوش ہیں سب اور گھر سفید جیسے بیاضِ چشم ادھر اور اُدھر سفید

حضرت علی اکبرؓ کا چھوٹا سا نیزہ دشمن کے بھالے سے ٹکرایا ہے ؎

غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

غیض اور غضب کی حالت ؎

یوں غیض تھا عمرو کے طلب سے دلیر کو	جس طرح ٹوک دے کوئی غصہ میں شیر کو

تلوار کے جوہر چمک اور خم کی تشبیہ ؎

جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کی چال کا	بجلی کی زرق برق تھی خم خم ہلال کا

ڈھال پر تلوار کو نہایت آسانی سے روک لینا ؎

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جھول کو	جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

خزاں کے موسم میں پتوں کی حالت ؎

پتے برنگ چہرۂ مدقوق زرد تھے

(۵) بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہے اس قسم کی تشبیہیں میر صاحب کے ہاں اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہیں اگرچہ فی الحقیقت ان سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہے جو اصلیت سے بہت دور کر دیتی ہے۔

گرمی کی شدت کا بیان ؎

گرداب پہ تھا شعلۂ جوالہ کا گماں	انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں	تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیٔ روز حساب تھی

ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ میر صاحب نے تشبیہ میں کیا کیا لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں۔

چہرہ پر خط کی نمود ؎

دیکھو نئی بہار کہ سبزہ ہے پھول پر

ہم لوگ زمانے میں احباب لب جو ہیں ؎

؎

ہلنے لگے درخت لرزنے لگے جبال　　سبزہ نہ تھا کھڑے تھے بدن پر زمیں کے بال

چلنے میں نیزے سے کانپتے تھے مثل پاسے پیر

گھوڑے کی تعریف ؎

سرعت میں تھا ہرن تو وفا میں ہنر تھا　　پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

بہار کا سامان ؎

پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے　　تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

مصرعہ - لہراتی ہے کیا نہر مثالِ شکمِ مار

مصرعہ - افلاک ہنڈولے کی طرح تھے تہ و بالا

رباعی

دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں　　(دوسرا مصرعہ یاد نہیں)

یا رب ترا نام پاک جپنے کے لئے　　گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں

؎

اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس نشان سے　　گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے

؎ گر میان تھا تو تیغ دم امتحان نہ تھی　　یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زبان نہ تھی

؎ یوں جلوہ گر زرہ میں تن سرخ فام تھا　　گویا بچھا ہوا چمنستان میں دام تھا

؎ چپ ہوں مگر زبان وہی اپنی کام میں　　گویا کہ ذوالفقار علی ہے نیام میں

؎ ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا　　شرما کے مہ نو نے چھپایا ہے سر اپنا

مصرعہ - رہوار کیا ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

؎ بیٹھا ہے شیر پنجہ کو ٹیکے ترائی میں　　(آنکھ کی پتلی کی تشبیہ)

۵ کالی وہ ڈانڈا اور وہ چمکتی ہوئی سناں — غل تھا کہ اژدہا ہے نکالی ہوئے زباں
۵ نیزوں کی سناں کو شمشیر نے کاٹا — غل تھا کہ سرِ شمع کو گلگیر نے کاٹا
۶۔ ذرے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے

فقط

شبلی نعمانی

میر انیس پر اجمالی نظر

میں نے میر انیس کے ہزاروں مرثیوں میں سے دو ڈھائی سو مرثیے دیکھے ہونگے جو کثرت تصنیف کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ اسی مقدار پر سلاموں اور رباعیوں کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ انکے سوائے مولانا آزاد، مولانا حالی، مولانا امداد امام، مولانا شبلی جیسے سخن شناس و نقاد چار شمس العلماؤں کی روشنی میں اس مقام تک پہنچا ہوں کہ اپنی اجمالی رائے کا ایک مختصر خاکہ پیش کر سکوں کیونکہ تفصیلی رائے کے لئے نہ تو وہ سامان میرے پاس ہے اور نہ زمانہ اتنی فرصت کی اجازت دیتا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ جو آنکھیں قطرہ میں دریا اور ذرہ میں صحرا دیکھنے کی نگاہ رکھتی ہیں۔ وہ اس اجمال میں ایک تفصیلی صورت کو دیکھ سکیں گی۔

واضح ہو کہ میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اس میں سے ۵۶ - ۵۷ سال مشق فن کی تکمیل میں گذرے۔ اکثر طبائع کا خاصہ ہوتا ہے کہ جوانی کے بعد بڑھاپے میں وہ رنگ نہیں رہتا۔ گویا دلی جذبات بھی جوانی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نواب میرزا داغ دہلوی اس کا ایک خاص نمونہ ہیں جن کے دواوین سے حسب اقتضائے عمر اُن کے جذبات کے تھرمامیٹر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور قدماسے فارسی میں حضرت امیر خسروؒ

دہلوی جیسا قادر الکلام اپنی تصنیفات کو حسب اقتضائے عمر کئی حصوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے بڑھاپے میں اُن کی امنگیں جوش زن معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ دوسرے شعرا نے غزلیات و قصائد یا مثنویات عشقیہ و واسوخت سے سروکار رکھا جو آنی اور فانی ہیں جو اپنے تعلقات یا عہد شباب تک باقی رہے۔ اور جب وہ صورت اور وہ حالت باقی نہ رہی تو وہ جذبات بھی رخصت ہوئے برخلاف اُن کے میر انیس کے باطنی جذبات بطور عقیدہ مذہب اُس حُسن سے وابستہ ہیں جو آخر دم تک قائم رہنے والے ہیں۔ اور اُس حسن کی تحریک ہر وقت جذبات کو نئی نئی اداؤں سے اُبھارتی رہتی اور قیامت تک اپنے ساتھ رہنے کا یقین دلاتی رہے یہی وجہ ہے کہ اکثر مرتاض صوفیہ کی زندگی میں بڑھاپے کا ضعف اُنکے کلام پر اثر کرتا ہوا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ آخر وقت تک حُسن مجرد کی اداؤں سے متلذذ ہوتے رہتے ہیں اور وہ لذتیں انکے جذبات کو اُبھارتی رہتی ہیں۔ اسی لئے میں میر انیس کی تصنیف کو بجائے اسکے کہ عمر کے لحاظ سے تقسیم کروں زبان کے لحاظ سے تقسیم کرتا ہوں۔ اور اُسکے تین زمانے قرار دیتا ہوں۔

(۱) ایک وہ جب میر انیس مشق فن کے لئے زمین سخن درست کر رہے اور اُس میں نہایت اعلیٰ درختوں کی قلمیں لگا رہے تھے۔

(۲) دوسرے وہ جب اُن قلموں نے نشو و نما پا کر درختوں کی صورت پیدا کی۔

(۳) تیسرے جب اُس میں پھل پھول نمودار ہوئے۔

اس تقسیم میں پہلا حصہ وہ ہے جس میں میر تقی اور سودا کے بعض الفاظ جو آگے چلکر متروک ہو گئے یا خاص ترکیبیں جن کو آیندہ زمانہ نے متروک کر دیا میر انیس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ باقی دو حصوں میں کسی لفظ یا ترکیب متروک کا نام و نشان نہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ مناظر قدرت اور جذبات فطرت کی تصویر کھینچ دے مثلاً صبح کے وقت جو

جو کیفیت مشاہدہ ہوتی ہے اُس کی تصویر لفظوں میں کھینچ دی جائے۔ اور رنج، غم، خوشی غصہ وغیرہ جذبات کی حالت جوں کی توں لفظوں میں دکھائی جائے۔ یہ کمال اُردو شاعروں میں میر انیس کا حصہ سمجھنا چاہیئے۔

فردوسی نے شاہنامہ میں پہلوانوں کے فنون جنگ کی تصویریں اس خوبصورتی سے دکھائی ہیں کہ اُس کی نظیر فارسی اور عربی میں نظر نہیں آتی پھر نظامی نے سکندر نامہ میں ہر طرح کی زور آزمائی کی ہے لیکن میر انیس نے مبارزوں کے تیغ و سناں کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ فردوسی اور نظامی دونوں سے بڑھکر مرقع حیرت نظر آتی ہیں ناظرین اس کی تفصیل آئندہ ملاحظہ کریں گے۔

عربی شاعری میں رجز کا خاص حصہ ہے جسکو میدان جنگ سے خاص تعلق ہوتا تھا اُس کی مثال اُردو شاعری میں سوائے مرثیہ گوؤں کے اور کہیں نہیں ملتی۔ میر انیس نے اشعار رجز کو نہایت پُراثر لفظوں میں بیان کیا ہے جو آپ آئندہ ملاحظہ فرماویں گے۔

میر انیس کی شاعری میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ خاص اثر دے سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور بی بی اور کنیز اور آقا و خادم چھوٹے بڑے کے مخصوصات ادب کے لئے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے ہیں۔

میر انیس ثقیل لفظوں اور تعقید کلام کو بالکل ناپسند کرتے ہیں۔ اور اُنکو کیسا ہی مضمون ہاتھ لگے لیکن جب تک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈھ نہیں لیتے۔ اُس مضمون کو داخل نظم کرنے پر متوجہ نہیں ہوتے۔ میر انیس کا کلام بلاغت کی جان، سلاست کی روح اور فصاحت کی کان ہے۔

میر انیس فصیح لفظوں کو اس خوبی سے ترتیب دیتے ہیں جیسے جڑیا نگینوں کو نہایت صحیح مناسبت کے ساتھ تھیوں میں بٹھاتا ہے۔

میر انیس کا روزمرہ اتنا صاف اور منجھا ہوا ہے جو لکھنؤ جیسے شہر میں بے مثل مانا جاتا رہا ہے۔ ان کی روزمرہ کی بول چال پر تمام لکھنؤ مٹا ہوا ہے جو اُن کی شاعری کی جان ہے۔

میر صاحب کے تسلسل بیان میں وہ خوبی ہے کہ کہیں سے کوئی کڑی علاحدہ ہی نہیں ہوتی۔ اور ایک کڑی دوسری کڑی سے اس خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو پہچانی نہیں جاتی۔ جیسے مرصع زیورات میں اعلیٰ کاریگر کا لگایا ہوا ٹانکا جو بالکل وصل ہو جاتا ہے اور دو حصوں کو وصل کر دیتا ہے۔

فردوسی نے بہت سے بادشاہوں اور پہلوانوں کی لڑائیوں کو مختلف طور سے لکھا ہے لیکن میر انیس نے کربلا کی ایک مختصر جنگ میں وہ تمام سامان دکھائے جو بعض شاہنامہ میں بھی نظر نہیں آتے۔

میر انیس کے کلام سے ہر موقع کے مناسب حال وہی اثر پیدا ہوتا ہے جو اُس واقعہ یا اُس حالت کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

میر انیس جوان۔ بوڑھے بچے کی مقتضائے فطرت کے موافق کلام کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور یہ تینوں فرق اُنکے کلام سے علاحدہ علاحدہ محسوس ہوتے ہیں۔

میر انیس کو ایک مشکل یہ پیش آئی ہے کہ میدانِ جنگ میں امام علیہ السلام یا حضرتِ عباسؑ یا اور عزیز و انصار کے مقابلہ میں جو نامی پہلوان آئے ہیں اُنکے اوصاف مردانگی و پہلوانی کے اظہار کو بھی وہ الفاظ تلاش کئے ہیں جو فریق مخالف کے حسب حال ہو سکتے ہیں۔ اور انکی شقاوت دلیری تنومندی داؤں پیچ شہسواری اور اُن کے اسلحۂ جنگ اور میدان جنگ میں اُنکے گھوڑوں کی حسبت و خیر کا نقشہ برابر برابر کھینچتے گئے ہیں۔ اُن کو کسی تعریف کا بھوکا نہیں رکھا۔

لکھنؤ ایک بہت ہی خود پسند شہر ہے۔ یہاں کا کوئی اہل کمال دوسرے شہر والوں

کو اپنے سے بڑھکر نہیں جانتا بلکہ خود لکھنؤ کے بڑے بڑے کہن مشق ان کی چوٹوں سے خالی نہیں رہے - یہ میر انیس ہی کا حصہ ہے جو وہ اول سے آخر تک ہر طبقہ اور درجہ کے لوگوں میں فرد فرید مانے گئے اور حاضر و غائب کسی کی مجال نہ ہوئی جو انکی نسبت زبان کھولتا - اور جو میرزا دبیر کی طرف کے کچھ لوگ زبان درازی کر بیٹھتے ہے وہ ایک طرح کی چلی کٹی سمجھی جاتی تھی باقی ہیچ -

اسی طرح دلی کے تمام زبان آور میر انیس کے دلدادہ پائے گئے - میرزا غالب ایسی لاثانی قدرت کلام پر میر انیس کا دم بھرتے تھے - اور فرماتے تھے کہ میر انیس کے مقابلہ میں دوسرے کا مرثیہ کہنا میر انیس نہیں بلکہ خود مرثیے کا منہ چڑھانا ہے - اور آج تک دلی اور لکھنؤ میں میر انیس کی مرثیہ گوئی کو معجزۂ کلام مانا جاتا ہے -

مفتی میر عباس صاحب ادیب کانپوری انار اللہ برہانہ جن کے فضل و ادب کا زمانہ معترف ہے میر انیس کے کمال شاعری کو معجزۂ کلام فرمایا کرتے تھے جناب مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر لکھنوی جو علاوہ مذاق اردو کے انگریزی شاعری میں بھی کمال رکھتے ہیں جن کی نسبت میر انیس کے خلف الصدق میر نفیس مرحوم نے ایک ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ آپ کی داد کو ایک ہزار آدمی کی داد کے برابر مانتا ہوں میر انیس کی نسبت خدائے سخن سے کم درجے کے الفاظ بولنا سوء ادب تصور فرماتے ہیں -

پیرس اور انگلستان کی علمی سوسائیٹیوں میں جہاں مشرقی زبانوں کے نامور سخن طراز دں کی قدر کی جاتی ہے - اردو زبان کے لئے میر انیس کو ہیرو تسلیم کیا گیا ہے اور جناب مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے ڈبلن کی یونیورسٹی میں میر انیس کے کمال شاعری کی بصراحت داد دی

لیکن کمال افسوس کی بات ہے کہ میر انیس کے کلام کا کثیر حصہ جو چار پانچ جلدیں چھپنے سے باقی رہگیا وہ جہاں تہاں ایسی حالت میں ہے کہ اگر وہ پریس تک نہ لایا گیا تو بتدریج دوسری صورتوں میں منتقل ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کرتا ہے -

انگریزی شاعری کی مقابلہ میں اردو شاعری

اور

انگریزی شاعروں کی مقابلہ میں میر انیس اور اردو شاعر

ایک نہایت ضروری مضمون ہاتھ لگا ہے جو ہمارے مخدوم و مکرم مولوی زکی الدین صاحب رئیس کاکوری کے فرزند اکبر مسٹر امیر احمد صاحب علوی بی اے کی محققانہ تحقیق و تنقید کا نتیجہ ہے۔ ایک ٹیبل کے ایک سرے پر ایک انگریزی لیمپ روشن ہے جس میں کیروسن آئل بھرا ہوا ہے۔ دوسرے سرے پر ایک فانوس میں شمع کافوری جل رہی ہے جو چربی، موم، کافور وغیرہ سے بنائی گئی ہے۔ کیمسٹری کے جاننے والے دونوں گیسوں کے اجزا رکے موثرات کو دریافت کرلیں کہ انگریزی لیمپ کا گیس ہوا کے ذروں میں مل کر کیا اثر پیدا کرتا ہے۔ اور شمع کافوری کے ہوائی اجزا سے کیسی تاثیر پیدا ہوتی ہے مجکو یقین ہے کہ اس مضمون کو اس کتاب کے پڑھنے والے عموماً اور انگریزی تعلیم یافتہ خصوصاً دلچسپی اور امعان نظر سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ مضمون انگریزی خوانوں کو ایک اعلیٰ درجہ کی دوربین کا کام دینے والا ہے جس سے وہ دونوں شاعریوں کو دور سے دیکھ سکتے ہیں اور ہر ایک کے خط و خال اور حسن و جمال کے سونے کو حسن مذاق کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔ میں اس مضمون سے صرف وہی حصہ لیتا جو میر انیس سے متعلق ہے لیکن ایسی صورت میں اس تصویر کا حسن بہت کچھ گھٹ جاتا اور انگریزی اردو شاعریوں کا مقابلہ جو اس وقت میں ایک ضروری خیال ہے نہ ہوسکتا اس لئے

ہیں کسی قدر تفصیلی اقتباس کرتا ہوں۔

وھو ھذا

کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری مخرب اخلاق ہے۔ اس میں فطرتی جذبات اور بلند خیالات کا پتہ نہیں۔ وہ خلاف قیاس تشبیہوں اور بیہودہ استعاروں سے مملو ہے۔ فلسفیانہ مضامین اور کارآمد فنون کا اُس میں کہیں ذکر نہیں۔ اور وہ یورپ کی نیچرل اور دلچسپ شاعری کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی۔

کون کہتا ہے؟ ہمارے ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل جس کی ترقی اور تنزل پر ہماری قوم کا آیندہ عروج یا زوال منحصر ہے۔ اور جس نے مغربی تعلیم کی برکتوں سے فیضیاب ہو کر بجائے خود یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُردو شاعری اس قابل نہیں ہے جس کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔

اگر وہ شخص جس کو ہماری تمدنی ترقیوں سے دلچسپی نہو ان خیالات کا حامی بنے تو ہم کو شکوہ و شکایات کا حق حاصل نہیں، لیکن دل پر چوٹ لگتی ہے جب خیال آتا ہے کہ یہ عقائد اس نئی نسل کے ہیں جو مقدس اسلاف کی قابل یادگار خیال کی جاتی ہو اور جسکی طرف اسوقت سب کی نگاہیں بڑی امیدوں سے لگی ہوئی ہیں کیا ترقی اور عروج کی امید کی جا سکتی ہے اُس گروہ سے جو فرحت و انبساط کے اصلی ذریعے اور کل دنیوی ترقیوں کے سچے وسیلے سے بہرہ اندوز ہونا ہی نہیں چاہتا۔ کیونکہ بقول "کارلائل" کے کسی قوم نے حیاتِ جاوید حاصل نہیں کی جب تک کہ اُس میں کوئی قادر الکلام شاعر پیدا نہیں ہوا، اور نظر میں شعر ہی کی وقعت نہ رہی تو ایسا شاعر پیدا ہونا معلوم!!

کیا وہ ہندوستان کے باشندے جو اردو شاعری کو نام دھرتے ہیں اس خیال میں

ہیں کہ انگلستان کے شاعروں کے فیض سے وہ اُس کھوئے ہوئے جوہر کو حاصل کریں گے جس کی طرف کارلائل نے اشارہ کیا ہے ؟ ہرگز نہیں۔

اُردو شاعری کو بُرا کہنے، گالیاں دینے، اور اس پر ہر قسم کے الزام لگانے کا تمہیں اختیار حاصل ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ انگریزی نظموں میں وہ کونسے جوہر ہیں جو تمہارے یہاں تلاش سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے اور تمہاری شاعری میں کیا بُرائی ہے جس کا نمونہ انگلستان میں موجود نہیں۔

انگلستان کے شعرا نے ایک اعلیٰ درجہ کی نظم کے لئے جو اوصاف ضروری قرار دئیے ہیں وہ تمہاری شاعری میں موجود ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کس حد تک۔

شیلی جو پچھلی صدی عیسوی میں ایک مسلم الثبوت شاعر گذرا ہے اور جس کی ہر لعزیزی کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ ابھی حال میں اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند خط لندن میں تقریباً آٹھ ہزار پر نیلام ہوئے ہیں اور امریکہ کے ایک جوہر شناس نے اُن کو خرید کیا ہے نظم کی تعریف یوں کرتا ہے۔

"شاعری نیچر کی پوشیدہ دلفریبیوں کے چہرہ سے نقاب اُٹھا دیتی ہے اور اسکے اثر سے ہم کو نامانوس چیزیں مانوس معلوم ہونے لگتی ہیں۔

دیکھو شیلی نے کس قدر مختصر الفاظ میں کل مغربی شاعری کا نتیجہ ظاہر کر دیا ہے۔ فی الحقیقت یورپ میں شعر گوئی کا مقصد صرف یہی ہے کہ شاعر کی اُس گہری نظر سے جو دنیا کی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بغور دیکھتی ہے جن کو عوام الناس معمولی سمجھ کر خارج از ذہن کر دیتے ہیں ہر شخص مستفید ہو اور وہ نیچر کی کل نزاکتوں اور لطافتوں سے حظ اُٹھانے کا عادی ہو جائے اور کم سے کم اُس حسن و خوبی کو تو ہرگز فراموش نہ کرے جس کو شاعر نے ایک خوش اسلوبی سے اس لئے موزوں کر دیا ہے کہ یاد رکھنے میں سہولت ہو۔

ہمارے ملک اور نیز ایران میں جس کے خیالات سے ہم بہت دنوں تابع رہے ہے شاعری کا موضوع نہ تھا۔

یہاں روحانیت اور فلکیات سے فرصت ہی نہ تھی کہ اجرام و اجسام کی طرف متوجہ ہوتے تاہم اگر تم شیلی ہی کے قول کو معیار سخن بناؤ اور اسی محک پر نظم کا کھوٹا کھرا پرکھنا چاہو تو تم کو اُردو شاعری کے سدا بہار گلشن میں ایسے اشعار کا ایک معقول سرمایہ مل جائیگا جو یورپ کی اعلیٰ بلند پروازیوں کا مقابلہ کر سکے۔

ایک معمولی بات ہے کہ ہر سال خزاں آتی ہے درختوں کے پتے زرد ہو کر جھڑ جاتے ہیں۔ ایک مقررہ میعاد کے بعد بہار کا موسم آتا ہے اور باغ دوبارہ سرسبز ہو جاتی ہیں یہ نیچر کی ایک معمولی کارروائی ہے جسکو ہم مدت العمر سے دیکھ رہے ہیں اور کوئی نئی بات اس میں نہیں معلوم ہوتی۔ اب اگر شاعر ہمارے دل پر یہ حسن نقش کرنا چاہتا ہے تو وہ یہی معمولی بات اس خوبی سے بیان کریگا کہ ایک اچنبا سا ہو جائے اور دل میں بات گڑ جائے وہ یوں کہے گا:۔

بہار آئے الٰہی چمن ہری ہو جائے ۔۔۔ یہ زرد زرد ہر اک شے ہری ہری ہو جائے

تم کہو گے کہ بہار کا موسم چونکہ مے پرستی اور عیاشی کے لئے نہایت موزوں ہے اور مشرقی شعرا نے اس فصل کی تعریف میں بہت خامہ فرسائی کی ہے اس لئے ہزار میں ایک شعر ایسا بھی نکل آیا جو شیلی کے معیار سے صحیح اُترتا ہے۔ لہذا تصویر کا دوسرا رُخ دکھاتا ہوں۔

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر کی گرمی کی ۔۔۔ بہت سی گرد بہت سا غبار راہ میں ہے
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ۔۔۔ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

صبح کا سہانا سماں تم روز دیکھتے ہو۔ دیکھو ایک شاعر پچھلے پہر کی پوشیدہ دلفریبی کے چہرے سے کیا عجیب و غریب پردہ اُٹھاتا ہے اور تمہیں کیا عمدہ بات

سمجھاتا ہے ؎

محفل برخاست ہے پتنگے | رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر | تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم | یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ حال اور ہم کو | کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

یہ اشعار غالباً شبلی کے قول کا مطلب سمجھانے کے لئے کافی ہیں اور اس دعوے کا بھی ثبوت دے سکتے ہیں کہ اگرچہ بقول ہمارے جادو نگار شاعروں نے کبھی پیش نظر نہیں رکھا اور نہ وہ اُس کو شعر کا موضوع لہ سمجھتے تھے تاہم وہ اکثر موقعوں پر بے ساختہ ایسے اشعار کہہ گئے ہیں جن میں یہ صنعت بدرجہ کمال موجود ہے۔

تم کو میر اور میر درد کے کلیات میں ایسے اشعار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ سید انشا بھی کبھی کبھی نیچر کے جلوے دکھا جاتے ہیں۔ آتش و غالب کے دواوین میں بھی اسکی جھلک نظر آجاتی ہے اور نظیر اکبرآبادی کا وہ کلام جو پروفیسر عبد الغفور شہباز نے ابھی حال میں مرتب کیا اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپوایا ہے اس قسم کے اشعار، غزلوں، اور قصائد وغیرہ کا معدن ہے۔

انگلستان ہی کے ایک فلاسفر کا قول ہے کہ "شاعری اور اخلاق ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں"۔ جو عہد کہ عبادت و دینداری کے لئے مشہور ہے اُس کی شاعری بھی عموماً پاکیزہ ہوتی ہے اور جس زمانہ میں آوارگی اور بدچلنی کا عام رواج ہوتا ہے اُس وقت کی شاعری بھی اکثر مخرب اخلاق ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ میں انگلستان کو عیسائیوں کا پیورٹن فرقہ ترک لذات اور دنیا فراموشی کی تعلیم کر رہا تھا ملٹن پیدا ہوا اور جب شاہ جارج چہارم کا دور دورہ تھا بائرن کی دھوم مچی۔ یا یوں کہو کہ جب خدا شناسی اور معرفت حق کے چرچے تھے مرزا مظہر جانجاناں اور میر درد پیدا ہوئے اور جب

واجد علی شاہی رنگ محل اپنے دلکش تماشے دکھارہے تھے جان صاحب اور نواب مرزا
نے مقبولیت عام حاصل کی۔

اگر انیسویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کا ملٹن فلکیات کی تشریح کرتا یا
نصیر الدین حیدر کے دربار میں میر درد عشق حقیقی کا وعظ دیتے تو نہ عوام کے دل پہ
بات جمتی اور نہ اُن کو شہرت عام کے دربار میں جگہ ملتی جس گروہ کے لئے شاعر نے شعر کہا ہے
اُس کے خیالات کی تبعیت شاعر کا پہلا فرض ہے اور اگر اس دائرہ سے بال برابر
سرکا ہے تو جو کیفیت اُسکو بیان کرنا مقصود ہے سامع کے دل پر نقش نہ ہوگی اور نظم کا
مقصد اعلیٰ فوت ہو جائے گا۔

وہ کوتاہ نظر ناعاقبت اندیش جنہوں نے نہ انگریزی سوسائٹی کے رسوم و قواعد پر غور
کیا ہے اور نہ وہاں کی اعلیٰ شاعری کو نکتہ چینی کی نظر سے دیکھا ہے اپنی قومی شاعری کا
رنگ مٹانیکو کہدیتے ہیں کہ وہ مخرب اخلاق ہے حالانکہ مقابلہ کرکے دیکھو تو معلوم
ہوگا کہ ہمارے شعرا نے باوجود بے حد آزادی اور بیباکی کے کبھی اس قدر مخرب خیالات کو
نظم نہیں کیا جتنا کہ انگریزی شعرا کے کلام میں ملے گا اور جو بعض فضول گو بیہودہ نویسوں
نے فحش بکا بھی ہے تو وہ اُس قدر بُری طرح اور ایسی بے حیائی سے بیان کیا
ہے کہ ہنسی تو چاہے آجائے مگر دل میں خاک اثر نہ ہوگا۔ اور جب دل پر اثر ہی نہوا
تو مخرب اخلاق ہونا معلوم !!

البتہ انگلستان کی اعلےٰ شاعری کی سیر کرو۔ وہاں کے سائنٹفک
اور عالی دماغ شعرا کا کلام دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بدوضعی اور آوارگی کا دلکش فوٹو
ایسی خوش ادائی سے اتارتے ہیں اور اس کی تعریف و تشریح میں اس قدر نیچر کے
اصول کی پابندی کرتے ہیں کہ زاہد صد سالہ بھی سُنے تو تسبیح و مصلا چھوڑ کر پیمانہ
ہو جائے۔

بائرن نے ڈان جون (Don Juan) میں اپنے ملک کی تہذیب کا جو کچا چٹھا بیان کیا ہے اور جن مخش وگندہ الفاظ میں وہ لکھا ہے اور جس قدر برا اثر وہ عوام کے قلوب پر ڈالتا ہے اُس کی مثال ہمارے یہاں جان صاحب اور میاں عصمت کے کلام میں بھی نہ ملے گی۔

شیکسپیر نے ریپ آف لیوکریشیا Rape of Lucretia میں جو دیا سلائی کے کبس جوانوں کے دل میں آگ بھڑکانے کے لئے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دیئے ہیں اُنکے سامنے طلسم الفت، میرحسن اور بہار عشق کے وہ سین جن کو دیکھ کر آج تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بھنویں تن جاتی ہیں گرد ہیں۔

ملٹن کے سے زاہد خشک نے پیر ڈائز لاسٹ Paradise Lost میں اپنی جدہ محترمہ یعنی ایڈم Adam کی بی بی ایو Eve کو برہنہ کر کے اُنکے اعضائے جسمانی کی جو تشریح کی ہے اُس بے جھجکی کی مثال خدا کا شکر ہے کہ ہماری شاعری میں نایاب ہے اور وہ موثر نظم جو انگلستان میں برائیڈس کنفیشن آف دی فرسٹ نائٹ Bride's Confession of the first night کے نام سے مشہور ہے اور جس کا نام صفحہ قرطاس پر رقم کرتے ہوئے قلم مست ہوتا ہے اس قابل ہے کہ اُس نئی تعلیم یافتہ نسل کو جو انگلستان کی ہر دلعزیزی ادا پر جان دیتی اور اُسکے ہر فعل کو معراج تہذیب وکمال شائستگی سمجھتی ہے عرق شرم میں غرق کردے اور مُنہ دکھانیکے قابل نہ رکھے۔

وہ نظمیں جو آج انگلستان کا سرمایہ ناز و افتخار ہیں اور جن کو انگریزی لٹریچر کی بزرگ الماریوں میں معزز جگہیں دیجاتی ہیں سرتاپا فحش وگندہ خیالات سے بھری ہوئی ہیں لیکن خدا کی شان ہو کہ ہماری شاعری جو ہمیشہ اخلاق کی اعلیٰ تعلیم دینے کا بیڑہ اٹھائے رہی جسکا ایک معتدبہ حصہ تصوف، معرفت، پند ونصائح۔ وعظ وتلقین۔ اور خداترسی

کی تعلیم پر وقف رہا اور جس کا بہترین حصہ فحش و گندہ خیالات سے بالکل الگ رکھا گیا آج اس نئی نسل کے ہاتھوں سے جس نے انگریزی شاعری کا نمونہ اُن منتخب نظموں کو سمجھ لیا ہے جو مدارس کے ابتدائی درجوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اور جن کے مضامین اس قسم کے ہوتے ہیں کہ "اے اونٹ تو بڑا سیدھا اور حلیم الطبع ہے اور تجھ میں بچوں کی سی مسکینی ہے" یا "کالن کے پاس دس بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک بھی نہیں" مخرب اخلاق سمجھی جاتی اور اس قابل نہیں خیال کی جاتی ہے کہ مہذب مجلسوں میں اس کا ذکر کیا جائے اور وہ شاعری جو بدکاری اور آوارگی سکھانے کا سچا آلہ، خیالات کو گندہ اور خراب کرنے کا سہل الوصول ذریعہ، اور زاہد پاکباز کو بھی ایک رند مست بنا دینے کا مجرب نسخہ ہے فلسفیانہ نزاکتوں سے مملو کہلاتی ہے۔

زینہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار در خیالِ کس نگشتی کانچناں گردد چنیں

ملٹن[*] کہتا ہے "سب سے عمدہ نظم وہ ہے جو سادہ نازک خیال اور موثر ہو" سادہ نظم سے یہ مراد ہے کہ عبارت پیچدار نہو اور قوانین فطرت سے تجاوز نہ کیا ہو۔

اس مقام پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ قانون فطرت شاعرانہ اعتبار سے دو قسم کا ہوتا ہے اول تو فطرت کے وہ معمولی اصول و ضوابط جن کا بنی نوع انسان پر اثر پڑتا ہے اور جن سے سب بیش و کم مانوس ہوتے ہیں اور دوسرے وہ قواعد بائرن سے

---

[*] ملٹن کے اصلی الفاظ یہ ہیں (Simple, Sensuous and passionate) ان مبہم الفاظ کو انگلستان کے دانشمندوں نے مختلف معانی پہنائے ہیں اور اردو میں بھی انکا ترجمہ کئی طرح ہو سکتا ہے مگر میں نے اس تشریح کو ترجیح دی ہے جو بائرن کے مشہور ہمعصر فرمنٹ نے بحوالہ جرید ڈسن تحریر کی تھی اور اُسی تشریح کو پیش نظر رکھ کر میں نے ان الفاظ کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس تشریح کو ترجیح دینے کی یہ وجہ نہ تھی کہ اردو شاعری اس معیار پر بالکل صحیح اُترتی ہے بلکہ ملٹن کی کل عبارت پڑھنے سے یہی معنی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں اور اب انگلستان میں عام طور پر ان الفاظ کا وہی مطلب سمجھا جاتا ہے جو میں نے اس مضمون میں درج کیا ہے۔ ۱۲ (مولف)

جو اگرچہ عام فطرت کے خلاف ہیں۔ مگر شاعر نے کسی ضرورت سے اُن کو جائز کر لیا ہے۔

یہ موخر الذکر اصول اکثر خلاف قیاس باتوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نیچر کی سچی تصویر نہیں ہوتی لیکن اُن کی صحت و غلطی کا امتحان عام فطرت کے اصول سے نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کی جانچ اُن ہی قواعد سے کی جاتی ہے جو شاعر نے پہلے ہی فرض کر لئے ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر نے میکبتھ (Macbeth) میں چڑیلوں یا ڈائنوں کو اسٹیج پر بلایا ہے۔ ٹیمپسٹ (Tempest) میں جادو کا کھیل اور پریوں کا ناچ دکھایا ہے۔ مڈسمر نائٹس ڈریم (Midsummer nights' dream) میں جنوں اور پریوں کے افسانے لکھے ہیں اور اُن پر انسانوں کے ساتھ عشق و عاشقی کا الزام لگایا ہے یا خود ملٹن ہی نے پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں فرشتوں کو انسانی خواص عطا کئے ہیں۔ شیطان کی فوج اور خداوند لایزال کے لشکر سے آسمان پر لڑائی کرائی ہے جس میں بجائے ہتھیاروں کے پہاڑیاں اور درخت استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک شیطان سے توپ ایجاد کرائی ہے اور خدا کے لشکر کو ایک دن شکست دلائی ہے پھر خدا کے فرزند کو طلائی گاڑی پر سوار کرا کے میدان جنگ میں روانہ کرایا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ باتیں دنیا کے مقررہ اصول نیچر کو دیکھتے خلاف قیاس، بعید از عقل، اور بالکل خبط ہیں۔ مگر شاعر نے جب ایک امر محال کو ممکن کر لیا۔ اور اُسی ایجاد کردہ دائرہ میں اُس نے اپنے خیالات کو ظاہر کر لیا تو ہم اس پر یہ اعتراض ہرگز نہیں کر سکتے کہ اُس نے ایک غیر ممکن بات کیوں فرض کی البتہ اگر وہ اپنے ایجاد کردہ نیچر کے قواعد سے خود ہی کسی جگہ بھول کر یا بالقصد روگرداں ہو جائے تو ہم کہہ سکیں گے کہ اُس نے فطرت کا جو نیا قانون بنایا تھا اس کی پابندی خود نہ کر سکا اور یہ اُس کی طبیعت کی کمزوری اور شاعری کی خامی کی کافی دلیل سمجھی جائے گی۔

اب اس تشریح کے بعد اُردو کے کل اعلیٰ شاعروں کے کلام پر بالاستیعاب نظر ڈال کر کیا ایسے اشعار کی کوئی بڑی فہرست تیار کر سکتے ہیں جو قوانین فطرت کے خلاف ہوں اور ملٹن کی معیار سے پورے نہ اُتریں؟ اگر جن و پری، سحر و معجزہ کا ذکر ہوگا تو ہم کہیں گے کہ یہ فطرت شاعر کی ایجاد ہے۔ اگر حسن و نزاکت کی تعریف میں کوئی خلاف قیاس تشبیہہ یا بیجا مبالغہ ہوگا تو ہم کہیں گے کہ یہ حُسن کی فرضی تصویر ہے۔ اگر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے کارنامے یاد دلائے ہونگے یا گل و بلبل کے عشق و عاشقی کا بیان ہوگا تو ہم کہیں گے کہ ملکی خصوصیت ہے! اگر تم نا اُمید نہو۔ کوشش کرو۔ مگر ہمت مضبوط باندھو۔ اساتذہ کے دواوین پر بسیط نظریں ڈالو۔ مثنویوں کی خاک چھانو۔ ممکن ہے کہ تم چند ایسے خلاف قیاس مضامین تلاش کر لو جن کا کچھ جواب نہو سکے۔ اور میرے دعوے کی تردید ہو جائے مگر یہ فائدہ تو مجھ کو ضرور حاصل ہوگا کہ اسی حیلہ سے تمہاری شاعری کے وہ گراں بہا اور نایاب جوہر جن پر کئی سال سے زمانہ غفلت و عدم توجہی کے گرد و غبار کا انبار لگا رہا ہے اپنے حسن عالم افروز کی جھلک سے تمہاری نظروں میں چکا چوند پیدا کر جائیں گے اور اُس وقت تمہاری حب الوطنی کا دبا ہوا جوش اُبھر آئیگا اور تم بھی کہنے لگو گے کہ ہمارے شعرا نے جو کچھ کہا خوب کہا اور ایسا کہا ہے کہ اُس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ نیچر کے اصول کے پابند ہوں یا نہ ہوں۔ سچ کہتے ہوں یا جھوٹ بولتے ہوں۔ سادگی ظاہر کرتے ہوں یا بناوٹ اور تکلف کا سبق پڑھاتے ہوں مگر اُن کے کلام میں ایک خاص دلکشی ہے۔ جو بائرن اور شیلی کے بس کی نہیں اور جس سے ہمارے دل کو وہ فرحت اور ہماری طبیعت کو وہ سرور حاصل ہو جاتا ہے جو کل شاعری کا سچا موضوع ہے۔

ملٹن نے اعلیٰ شاعری کے لئے دوسرا ضروری جزو نازک خیالی کو قرار دیا ہے۔ جس سے یہ مطلب ہے کہ شاعری کو نئی نئی تشبیہیں اور تمثیلیں دکھا کر نظم کو دلچسپ

بتانا چاہئے۔ اس مبحث پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہماری تشبیہوں اور استعاروں کی نزاکت مسلم بین الفریقین ہے مگر بد قسمتی سے یہی جوہر جس کی انگلستان والے جستجو کرتے ہیں اور نہیں ملتا۔ ہمارے یہاں با فراط ہے اور نظر میں نہیں جچتا بلکہ اردو شاعری میں جو نقائص بتائے جاتے ہیں اُن میں سے ایک بہت بڑا عیب یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُردو شاعری میں بعض جگہ ضرورت سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے کبھی صرف لفظی رعایتوں کو پیش نظر رکھ کر اشعار میں نزاکت پیدا کی گئی ہے۔ اور کہیں استعاروں کے پیچ میں پھنس کر اصل مطلب گاؤخورد ہو گیا ہے لیکن ایسی مثالیں شاذ ہیں اور ان سب کی طرف سے یہ جواب کافی ہے کہ جب نازک خیالی ایک شاعرانہ جوہر ہے تو جس درجہ کمال تک وہ پہنچایا جائے اُتنا ہی زیادہ شاعرانہ خیالات کی پختگی سمجھی جائے گی۔

ملٹن کے نزدیک اعلیٰ شاعری کے لئے تیسرا ضروری جوہر یہ ہے کہ وہ موثر ہو۔ تاثیر کی بھی کئی قسمیں ہیں کبھی حسن و عشق کی تصویریں دکھانا منظور ہوتی ہیں کبھی ہنسانا اور تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا مقصود ہے۔ کبھی حسن و عشق کی تصویریں دکھانا منظور ہوتی ہیں کبھی پند و نصائح۔ وعظ و تلقین سے اخلاقی خوبیاں سمجھانا مدِ نظر ہوتا ہے۔ کبھی بجھی ہوئی طبیعتوں میں جوش پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کبھی شاعر کا منشا صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ سامعین کے دلوں میں ایک قسم کا سرور پیدا کرے غرض یہ یا اسی قسم کی اور کوئی تاثیر اگر شاعر انسان کے دل میں پیدا کر دے تو کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی نظم موثر ہے۔

یہ وصف بھی ہماری شاعری میں موجود ہے۔ اگرچہ ہر قوم، ہر ملک، اور ہر زبان کے اشعار بعض اچھے اور بعض برے ہوتے ہیں۔ اور اس سبب سے اردو کے بھی وہ اشعار

جو بیہودہ اور خبط ہوں ممکن ہے کہ کوئی خاص اثر پیدا نہ کریں مگر جو کلام موزوں کچھ بھی معنی رکھتا ہوگا ایک قسم کا اثر ضرور پیدا کرے گا خواہ وہ سریع الزوال ہو یا پائدار۔ البتہ ملٹن کا اصول پیش نظر رکھو تو کہنا ہوگا کہ جو نظم زیادہ اثر پیدا کرے یا جس کا اثر زیادہ دیر تک قایم رہے زیادہ عمدہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ جب تک شاعر کے دل میں درد نہیں ہوتا اور بقول کارلائل کے وہ وہ اظہار خیالات میں صادق البیان نہیں ہوتا اُس کے کلام کا اثر قائم نہیں رہتا مگر عالم اسباب کے واقعات کو بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دروغ کو بھی فروغ ہو جاتا ہے اور اسی طرح اگر تم اگلے اُستادوں کے دواوین دیکھو۔ ہمارے سرمایہ ناز مثنویوں کی ورق گردانی کرو تو معلوم ہوگا کہ اُن کا ہر ہر شعر خنجر و نشتر کا کام دیتا ہے بلکہ الماس کا قلم شیشہ کو اس صفائی و سرعت سے نہیں تراش سکتا جتنی آسانی سے اُن کا ایک ایک مصرعہ دل و جگر پر چرکے لگاتا ہے۔

میں اس وقت مثلاً دس یا پنج شعر لکھے دیتا ہوں اور اُنکے موثر یا غیر موثر ہونے کا انصاف تمہارے ہی اوپر چھوڑتا ہوں۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ۔۔۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

---

۱ یہ عشرت و عیش و شادمانی کبتک ۔۔۔ عشرت بھی ہوئی تو نوجوانی کبتک
گر یہ بھی سہی قیام دولت ہے محال ۔۔۔ دولت بھی ہوئی تو زندگانی کبتک

۲ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ۔۔۔ ہمکو غریب جانکے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ۔۔۔ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا ۔۔۔ ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

۳ ہر دم رہے انہیں زباں پر خدا خدا ۔۔۔ پھر جہانیں کون کسی کا ہے آشنا

دلداری و محبت و دلجوئی و وفا معدوم ہیں بصورتِ عنقا و کیمیا
گستاخ ہو کے عرض کیا ہے معاف ہو
ہم نے تو ایک دل بھی نہ پایا کہ صاف ہو

۴ یہ عیش کرنے پہ موقع نہ تھا اور گھات نہ تھی مہندی پاؤں میں تھی آنکھ برسات نہ تھی
دن کو آ سکتے نہ تھے آپ تو کیا رات نہ تھی کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی
بس یہی کہئے کہ منظور ملاقات نہ تھی

۵ اٹھا ہی شام ہی سے آج درد پہلو میں سحر تک اے مرے پروردگار کیا ہوگا
۶ خدا ہی خیر کرے آج رنگ بیڈھب ہے ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا
۷ پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
۸ ہم قفس میں رنگ گل سے باغ میں سارے ان کی دھوم دیکھکر اودی گھٹا زنداں میں بھر آتا ہے دل

ابتک تو ہم ان خوبیوں پر جو ملٹن نے شاعری کے لئے ضروری قرار دی ہیں فرداً فرداً بحث کر رہے تھے اور دکھا رہے تھے کہ ہماری شاعری قوانین فطرت کے خلاف نہیں۔ اس میں نازک خیالی بدرجہ کمال موجود ہے اور ایک خاص قسم کا اثر بھی قلوب میں پیدا کرتی ہے مگر اب ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ہی نظم میں یہ تینوں جوہر جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں کیونکہ ملٹن کا منشا یہی ہے کہ ان اوصافِ ثلاثہ کو ایک ہی نظم میں جمع ہونا چاہئے اور جب تک ان کا اجتماع نہوگا شعر اچھا نہ سمجھا جائیگا۔

ملٹن نے جو بعض اشعار میں ان قیود کی پابندی کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگلستان ہی کا ایک نکتہ چیں اسکے کلام کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ پڑھنے کے قابل نہیں بعض اور شعرا نے بھی اس اجتماعِ ثلاثہ کا لحاظ رکھا تھا مگر جب تک کوئی ایک قید ترک نہیں کی شعر میں مزا پیدا نہیں ہوا۔

البتہ ہمارے ملک کی اعلیٰ شاعری میں یہ دشوار اجتماع اس خوبی سے خود بخود ہو گیا ہے کہ

الہام کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت مقابلہ کے لئے میں ایک ہی قسم کے مضامین پر مغربی اور مشرقی شعرا کی زور آزمائیاں دکھاتا ہوں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ کرنے سے نظم کی خوبیاں باقی نہیں رہتیں اس لئے اصل انگریزی نظم تحریر کرتا ہوں اور مختصراً اس کا مطلب بھی اردو میں لکھ دیتا ہوں

شیکسپیر صبح کا سین یوں بیان کرتا ہے۔

Lo! hear the gentle lark weary of rest.
From his moist cabinet mounts upon high,
And wakes the morning from whose silver breast
The sun ariseth in his majesty;
Who doth the world so gloriously behold
The cedar-tops and hills seem burnished gold.

اب نازک اندام نواکافی آرام کر چکنے کے بعد اپنے آشیانہ سے نکل کر آسمان پر پرواز کرتا ہے۔ صبح کا سپیدہ پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ اور آفتاب شوکت و عظمت کے ساتھ طلوع ہوکر دنیا پر ایسی پر فیض نگاہ ڈالتا ہے کہ درختوں کی چوٹیاں اور پہاڑیاں طلائے احمر کی بنی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ملٹن صبح کی دلفریبی یوں ظاہر کرتا ہے۔

The sun, who, scarce up-risen,
With wheels yet hovering o'er the ocean brim,
Shot parallel to the earth his dewy ray,
Discovering in wide landscape all the East
Of Paradise, and Eden's happy plains.

آفتاب جو ابھی پورا طلوع نہیں ہو چکا اور جس کا ایک حصہ ابھی چشم مردم سے نہاں ہے
اپنی شاداب کرنیں سطح ارض کے متوازی پھیلاتا ہے۔ اور عدن کے دلکش اور خوش
سواد میدانوں اور فردوس کے مشرقی منظروں کو نورانی بنا دیتا ہے۔

فیچر صبح کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

See the day begins to break,
And the light shoots like a streak,
Of subtile fire, the wind blows cold,
White the morning doth unfold;
Now the birds begin to rouse,
And the squirrel from the boughs
Leaps, to get him nut and fruit;
The Early lark that erst was mute,
Carols to the rising day
Many a note and many a lay.

اب پو پھٹنا شروع ہوئی اور روشنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔
اور صبح کا حسن رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ سب چرند و پرند بیدار ہو کر اپنی ضروریات
کی طرف متوجہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور سحر خیز لوا جو ابھی تھوڑی دیر قبل خاموش تھا
شعر خوانی اور گیت گانا شروع کرتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ تینوں ٹکڑے جو میں نے اس مقام پر نقل کئے ہیں انگریزی شاعری
کا ایک بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ اور فی الحقیقت قابلِ تعریف ہیں۔ مگر ملٹن کے قاعدہ
کلیہ سے انکو پرکھو تو پہلے میں نازک خیالی ہے عبارت صاف نہیں۔ دوسرے اور

تیسرے میں سادگی ہے نازک خیالی کا پتہ نہیں اور مضمون پر غور کرو تو باستثنائے شیکسپیر کے کسی کے طرز بیان میں حلاوت نہیں۔ اب میں ایک مشرقی شاعر کے چند بند صبح کی تعریف میں لکھتا ہوں جو نیچر کی سچی تصویر ہیں جنہیں نازک خیالیاں بدرجہ کمال ہیں جنکا اثر بھی آسانی سے زائل نہیں ہو سکتا۔ اور جنکی عبارت سلیس اور طرز بیان دلکش ہے (انیس)

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح سرگرم ذکر حق ہوئی طاعت گذار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بدم مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکتی تھی پھونک پھونک کے قدم اپنا ہوائے سرد یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

تھا بسکہ روز قتل شہ آسماں جناب نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

یہ تو صبح کی دلفریب تصویر تھی اب رات کا تماشا ملاحظہ ہو۔

شیکسپیر رات کا موثر سین یوں کھینچتا ہے۔

Look, the world's comforter with weary gait,
His day's hot tack has ended in the west,
The owl, nights herald, shricks, 'tis very late
Sheep are gone to fold, birds to their nest;
And cool-black clouds that shaddow heaven's light
Do summer us to part, and good night.

آفتاب نے جو دنیا کا تسلی دینے والا ہے اپنی روزانہ مسافت تمام کی۔ اُلو چلا رہا ہے رات زیادہ آگئی۔ وحوش و طیور اپنی اپنی آرامگاہوں کی طرف رخصت ہوئے۔ اور سیاہ بادل جو آسمانی نور کو چھپائے ہوئے ہیں ہم کو الوداع کہنے کا حکم دیتے ہیں۔

ایڈورڈ ینگ رات کی تاریکی یوں دکھاتا ہے۔

Night, sable goddess! from her ebon throne
In rayless majesty, now stretches forth
Her leader sceptre 'er a slumbering world
Silence, how dead, and darkness how profound!
Nor no listening ear an object finds;
Creation sleeps.

رات! کالی دیبی!! اپنے آبنوس کے تخت سے بڑی شوکت و دبدبہ کے ساتھ تمام سوتی ہوئی دنیا پر اپنے سیاہ عصار شاہی کا سایہ ڈالتی ہے۔ کیا سنسان خموشی ہے اور کیسی گہری تاریکی ہے۔ اس وقت کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تمام مخلوق سو رہی ہے۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ پہلی نظم میں نازک خیالی نہیں اور دوسری میں اس قدر بلند پروازی ہے کہ سادگی کی حد سے متجاوز ہو گئی۔

البتہ ہمارا مشرقی شاعر یہی سین اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اوصاف اُس میں جمع ہیں۔ (انیس)

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی ‏ ‏ پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روحِ امیرِ عرب آئی ‏ ‏ غل تھا کہ شبِ قتلِ شہِ تشنہ لب آئی
سادات کو کیا کیا غمِ جانکاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اُس شب کی سیاہی ‏ ‏ ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغانِ ہوا پر ہیں تپاں بحر میں ماہی ‏ ‏ تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی
فریاد کا تھا شور رسولانِ سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

تھی طرفہ شبِ تار کہ تارے بھی تھے مستور ‏ ‏ اک پارہ ہے جس کا شبِ یلدا شبِ دیجور
دوڑے کہیں شبدیز نظر کا تھا نہ مقدور ‏ ‏ ہوتا نہ تھا ثابت کوئی نزدیک ہے یا دور
حضرت پہ وہ اُس تین پہر رات میں گذری
تکلیف سکندر پہ جو ظلمات میں گذری

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں ‏ ‏ تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نجانیں کہیں جائیں ‏ ‏ روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

تھا خانۂ خیمہ شہنشہ والا ‏ ‏ آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا

مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا

خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شیر خدا کے

تھا چین نہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

اس وقت ایڈورڈ ینگ کے چند اشعار یاد آئے جن میں یہ تینوں خوبیاں نہایت عمدگی سے جمع ہو گئی ہیں۔ چونکہ ان کا چھپانا انصاف کے خلاف تھا اس لئے وہ بھی لکھے دیتا ہوں۔

Tired natures sweet restorer, balmy sleep!
He, like the world, his ready visit pays
Where fortune smiles the wretched he forsakes
Swift on his downy pinion flies from woe,
And lights on lids unsullied with a tear
From short (as usual) & disturb'd respose,
I wake = how happy they who wake no more,
Yet that even vain, if dreams infest the grave.

"اے تھکی ہوئی طبیعت کو تر و تازہ کرنے والی نیند! تو بھی دنیا والوں کی طرح انہیں سے ملتی ہے جو خوش حال ہوں اور بدنصیبوں کو فراموش کرتی ہے۔ تو رنج و غم کے پاس نہیں پھٹکتی اور اُن آنکھوں میں جاتی ہے جو آنسوؤں سے بیداغ ہوں۔ میں آج بھی حسب معمول نہایت مختصر اور پریشان نیند کے بعد چونک پڑا۔ وہ لوگ کیسے خوش قسمت ہیں جو ایسی میٹھی نیند سوئے کہ کبھی نہ چونکیں گے مگر جو پریشان خواب قبر میں بھی ستاتے ہوں تو یہ آرزو بھی فضول ہے"

ہمارے ملک کے بھی ایک شاعر نے "نیند" پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

وہ بھی ملاحظہ ہوں ؎

وصل میں رفتارِ معشوقانہ دکھلاتی ہے نیند | آج کن اٹکھیلیوں سے آنکھ میں آتی ہے نیند
فرقتِ دلدار میں سہواً اگر آتی ہے نیند | آنکھ سے باہر ہی باہر آ کے پھر جاتی ہے نیند
کروٹیں لیلے کے کٹتے ہیں شب فرقت میں ہم | کس طرح ای خفتگانِ خاک آجاتی ہے نیند
نیند کو بھی نیند آجاتی ہے ہجرِ یار میں | چھوڑ کر یہ خواب مجھ کو آپ سو جاتی ہے نیند
فرقتِ دلدار میں جو رات بھر آئی نہ تھی | وصل میں آتے ہوئے آنکھوں میں شرماتی ہے نیند
منتظر رکھتی ہے غمزے کرتی ہے آتی نہیں | اذیت ترسا تری فرقت میں ترساتی ہے نیند
گرمیِ سوزِ جگر بیتاب کر دیتی ہے جب | ٹھنڈی سانسیں ایسی بھرتا ہوں کہ آجاتی ہے نیند
واہ رے تاثیرِ الفت دل سے ہے فردِ اتحاد | غش پہ غش آتے ہیں مجھ کو جب نہیں آتی ہے نیند

ہجر میں سونے کی ایسی ہے تمنا اے وزیر
دیکھتا ہوں اُس کو حسرت سے جسے آتی ہے نیند

جب یہ ثابت ہو گیا کہ شبلی نے نظم کا جو موضوع سمجھا ہے اور ملٹن نے اعلیٰ شاعری کے لئے جو اجتماع ثلثہ ضروری قرار دیا ہے اُس کا نمونہ ہمارے ملک کی نظموں میں موجود ہے اور نہایت خوبی لطافت و نزاکت سے ہے تو اُس نئی نسل کو جو انگلستان کے ہر دانشمند کا قول "کالوحی من السماء" سمجھتی ہے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو زبان کی منظوم شاعری میں وہ کل جوہر کافی طور پر موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجہ کی نظم میں ہونا چاہئیں اور باعتبار بلندی خیالات، صفائی بیان، صدق جذبات، خوبی بندش اور عجیب و غریب تاثیر کے وہ بھی اس قابل ہے کہ اُس کو یورپ کی اعلیٰ سے اعلیٰ شاعری کے برابر جگہ دی جائے، ہم یہ پیشتر ہی کہہ چکے ہیں کہ ہماری شاعری میں جو چند فحش اور غیر مہذب الفاظ ہیں وہ زمانہ کے اثر ہیں اور انگلستان کے مزخرفات سے بدرجہا غنیمت ہیں بلکہ پہاڑ کے نیچے آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہیں اسلئے یہ بھی ضرور ہے

ماننا ہوگا کہ انگریزی شاعری سراسر مہذب اور شائستہ ہے تو ہماری نظمیں اُن سے بھی زیادہ عمدہ اخلاق کی تعلیم دیتی ہیں اور ہمارے شعرا نے جو کچھ رطب و یابس کہا ہے وہ نیچرل جذبات و کیفیات کی تصویر اور فلسفہ کے دقیق مسئلوں کا لب لباب ہے۔

اب معرض بحث میں صرف یہ امر رہ گیا کہ ہماری شاعری میں اصناف سخن میں سے بعض کی طرف خاص توجہ کی گئی بعض کی طرف کم التفات کیا گیا اور بعض بالکل ترک کر دیئے گئے مثلاً غزلوں اور قصائد میں بڑی بلند پروازی دکھائی۔ رباعیات اور قطعات کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور ڈراما ایک بھی نہ لکھا۔

یہ ایک بالکل فرعی بحث ہے اور اسکے لئے صرف یہی جواب کافی ہے کہ ہمارے شعرا جو سوسائٹی کا عام مذاق سمجھتے تھے اور جس روش کو عام پسند خیال کرتے تھے اُسی پر زورِ قلم دکھاتے تھے۔ یا یوں کہو کہ جو سکہ بازار میں چلتا تھا اُسی کو جیب میں ڈال کر گھر سے نکلتے تھے۔ اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ نخاس پہنچتے پہنچتے زمانہ کی ہوا پلٹ جائیگی اور شاہ عالم کے درباریوں اور رنگیلے پیا جانعالم کے مصاحبوں سے شاہ ایڈورڈ ہفتم کا چہرہ دار روپیہ طلب کیا جائیگا۔

اس کو خواہ اُردو شاعری کی بدقسمتی سمجھو یا شعرا کے عالم الغیب نہونیکا قابل افسوس نتیجہ خیال کرو کہ ہمارے شعرا نے اپنی نازک خیالیاں زیادہ تر غزلوں کی صورت میں ظاہر کیں اور مسلسل نظموں کی طرف متوجہ نہ ہوئے جو آج انیسویں صدی میں اُنکے کلام کی قدر کی جاتی لیکن یہ تو بتاؤ کہ ایک واقعہ کا مختصر چند الفاظ میں بیان کر دینا اچھا ہے یا صرف طول سخن کے لئے اسی ایک مضمون کو عبارت کے پیچدار سلسلہ میں پھنسا کر صفحے کے صفحے سیاہ کر جانا ہے۔

چونکہ ہماری غزلوں کا ہر شعر عموماً ایک نیا مضمون اور نیا واقعہ بیان کرتا ہے اسلئے

شاعر کو مجبوراً اپنی نازک خیالی مختصر الفاظ میں ظاہر کرنا ہوتی ہے تاکہ شعر کی محدود بحر میں وہ کل مفہوم صاف طور پر ادا ہو جائے جو اُس وقت بیان کرنا مقصود ہے۔

انصاف کا خون ہے کہ اگر ایک مضمون پچاس شعروں میں ختم ہوتا تو اُس کی تعریف کرتے مگر چونکہ ایک ہی شعر میں بیان کر دیا ہے اس لئے داد نہ دیں گے!!

اگر معشوق کی تعریف میں سر والٹر اسکاٹ کی طرح کئی صفحہ سیاہ کرتے تو بڑی خوبی تھی اور اگر ایک ہی شعر میں کہہ دیا کہ"

حُسن بھی مہر و وفا بھی ہے مروت بھی ہے ناز بھی غمزہ بھی شوخی بھی شرارت بھی ہے

تو ایسا سخت گناہ کیا کہ جو ہرگز قابلِ معافی نہیں!!!

اساتذہ کے دواوین دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اُنکا ہر ایک شعر یا تو کسی طول طویل واقعہ کا خلاصہ ہے یا کسی جوش و خروش کی مختصر روئداد ہے یا کسی جذبۂ انسانی کے چھوٹے پیمانہ کی تصوٖیر ہے یا کسی اخلاقی مسئلہ کا حاصل مطلب ہے۔ غرض چند الفاظ میں اُن تمام کیفیات۔ جذبات، خیالات اور واقعات کا خلاصہ ہے جن پر شیکسپیر اور بائرن کو جداگانہ مستقل کتابیں تصنیف کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی ہے۔

مگر زمانہ کا رنگ کوئی بدل نہیں سکتا۔ غزلوں کی طرف سے ایک عام بے توجہی جو اس زمانہ میں پیدا ہو گئی ہے اُس کا دفعہ ہونا مشکل ہے اور نئی نسل نے (جو اس رمز سے آگاہ نہیں کہ غزل صرف مشق سخن بڑھانے اور طبیعت میں تیزی پیدا کرنیکے لئے ہے) اس کے متعلق جو نفرت و حقارت کے خیالات اپنے دل میں جمع کر لئے ہیں اُن کا مٹنا دشوار ہے۔

غزل پر کیا موقوف ہے بلکل مشرقی علوم و فنون کی ناقدری کا عہد ہے اس مقدس صدی میں غزل کی طرف سے جب ایک بار نظر اٹھالی تو وہ پھر چاہے کیسی ہی خوشنما اور آبدار موتیوں کی لڑی ہو لیکن ناشناس کھرل میں پیس کر رہیں گے۔ لہذا میں بھی اس صنف

سخن کو چھوڑ کر اُس بیش بہا گنجینہ کی طرف رُخ کرتا ہوں جس پر اُردو شاعری کو اپنے عروج و کمال کے زمانہ میں تو چنداں ناز نہ تھا مگر بیسویں صدی میں اُسی پر فخر کرنا بجا و درست ہے۔

اس انمول خزانہ سے میری مراد مثنویاں اور مراثی ہیں جن میں سے ایک چند مراتب میں انگلستان کے ڈراموں سے افضل ہے اور دوسرا یورپ کے ایپک پوئیم (Epic Poem) کا جواب ہے۔

اصطلاح شعرا میں ڈراما اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شاعر فاعل کو حاضر فرض کر کے اُس کے اقوال نقل کر دیتا ہے اور افعال سے کچھ بحث نہیں رکھتا۔

ہماری مثنویوں میں یہ لطف ہے کہ ہم ڈرامے کی طرح اقوال کا چربہ اُتارتے ہیں اور ساتھ ساتھ افعال کی بھی جھلک دکھاتے جاتے ہیں یعنی وہ سخت اور دشوار کام جو شاعر ڈرامے میں ایکٹر کے لئے چھوڑ دیتا ہے جس کو اصطلاح ناٹک میں لفظ موشن (Motion) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس پر ڈرامے کی عمدگی و خرابی بہاں تک منحصر ہوتی ہے کہ اگر کوئی ناتجربہ کار یا بدسلیقہ ایکٹر کسی ایک پارٹ کو خراب کر دے تو تمام تماشے کا لطف بگڑ جاتا ہے۔ ہماری مثنویوں میں شاعر خود ہی دکھا دیتے ہیں۔

مشہور ہے کہ لندن میں ایک بار اتھیلو کی ٹریجڈی کا پارٹ آئرلینڈ کی ایک نووارد ایکٹریس نے کیا تھا تو ہیروئن کے دردناک انجام پر حاضرین جلسہ بجائے غم کے آنسو بہانے کے اس قدر ہنسے تھے کہ آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور انگلستان کے مشہور ٹریجک ایکٹریس (Tragic Actress) مسز سڈنس (Mrs Siddons) نے ایکبار اسٹیج پر اپنا کمال دکھانے کے لئے چند مضحک پارٹ ایسی سنجیدگی اور متانت سے کئے تھے کہ ہنسی میں غم کا پہلو نکل آیا۔

غرض یہ ایک مسلم واقعہ ہے کہ خواہ کیسی ہی دردناک نظم اور کیسا ہی حسرت خیز سین ہو

لیکن جب تک ایکٹر کو پارٹ کرنے کا سلیقہ نہ ہو گا تماشہ کا رنگ نہ جمے گا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ ڈراما جسم ہے اور موشن روح۔ اگر روح لطیف ہے تو جسم کیسا ہی بدنما ہو عزت حاصل کریگا اور اگر وہ کثیف ہے تو جسم کیسا ہی حسین اور خوشنما ہو مگر حقارت اور نفرت عام سے اُس کا استقبال کیا جائیگا۔

جو ظالم اُردو شاعری میں ڈراما نہ ہونے کا داغ ایک قومی ذلت اور ملکی نقصان سمجھتے ہیں ذرا دل میں غور کریں کہ مردہ جسم چوراہے پر کتوں کے سامنے پھینک دینا اچھا ہے۔ یا قالب انسانی تیار کرکے اُس میں روح پھونکنا اور دنیا کے کاروبار میں اُس سے کام لینا!!

اگر موخرالذکر صفت افضل ہے تو اُس کی تعریف کی مصداق ہمارے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی مثنویوں میں عالی دماغی سے ایک نئی دنیا قایم کی ہے اور اُسکے باشندوں کو ہمارے سامنے چلتا پھرتا دکھا دیا۔ ہماری مثنویاں ڈرامے کی طرح ایکٹروں کی موشن کی محتاج نہیں ہیں بلکہ تم کتاب اُٹھاؤ اور کسی جگہ سے پڑھنا شروع کرو۔ عالم خیال میں آنکھوں کے سامنے تھیٹر سے زیادہ دلکش تماشہ ہونے لگے گا جس میں تم ایکٹروں کی آواز سنوگے اور اُن کی حرکات و سکنات پر بھی غور کرتے جاؤ گے۔

المختصر بہت آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے شعرا نے مثنویوں میں ڈرامے کی کل خوبیاں جمع کردی ہیں بلکہ ایکٹروں کے موشن دکھانا جو ایک مرقع نگار کا فرض نہیں وہ بھی اُنھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ ہمارے شعرا نے مثنویوں میں مسئلہ تثلیث الوحدت کا التزام نہیں رکھا جسکے بغیر سفا کلیز کی نظر میں کوئی ڈراما قابل وقعت نہیں ہوسکتا مثنویوں کی لئے ضروری نہیں سمجھا لیکن جب شیکسپیر جس کو اس صنف سخن کا خداوند کہنا درست ہے اس تثلیث کی ہمیشہ پابندی نہ کرسکا اور بائرن کے سے نازک خیال اور عالی دماغ بادشاہِ سخن نے مجبور ہوکر اس تثلیث سے منہ موڑا تو یہ خیال بھی بالکل بیجا ہے کہ اُردو مثنویاں

ڈراموں کی ہم پلہ اس وجہ سے نہیں ہوسکتیں کہ اُن میں تثلیث الوحدت کا التزام نہیں بیشک وحدت مضمون ہر قصہ کے لئے ضروری ہے اور یورپ کے قریب قریب کل ڈراموں میں اب قدیم یونانی مرقع نگاروں کی یاد دلانے والی صرف یہی ایک وحدت ہے جس کا ہمیشہ لحاظ رکھا جاتا ہے کیونکہ اگر ایک ہی واقعہ کی نقل کرنے میں دو متضاد روایتیں جمع کردی جائیں تو بمصداق دروغ گورا حافظہ نباشد جھوٹھ فوراً ظاہر ہوجاتا ہے (حالانکہ خدا کے فضل سے یورپ کے شاعروں اور قصہ نویسوں کو جھوٹ بولنے میں چشم بد دور وہ ملکہ حاصل ہے کہ بڑی بڑی ضخیم جلدیں سیاہ کرجائیں اور نکتہ چیں کسی جگہ سے ایسی خطا دریافت نہ کرسکے جو اس کے سچ ہونے میں شک ڈال دے) ہمارے ہندوستانی شاعر گو یورپ والونکے سے سیاہ اور گہرے جھوٹ نہیں بول سکتے لیکن اس وحدت کا انہوں نے بھی حتی الامکان خیال رکھا ہے اور ہماری مثنویوں میں بھی کوئی دو ایسی متضاد روایتیں جنکی تطبیق کسی طرح بھی نہو سکے تلاش کرلینا آسان نہیں ہے۔

ڈرامے کی ضروریات میں سے یورپ کے سخن شناسوں نے سرعت بیان موثر طرز گفتگو اور چہچل انداز تقریر کو بھی قرار دیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ اوصاف بھی ہماری مثنویوں میں موجود ہیں اور ان کل خوبیوں کی مثالیں تم کو اُن اشعار سے مل سکتی ہیں جو مثنویات میر حسن، گلزار نسیم، طلسم الفت وغیرہ میں موجود ہیں۔

اُردو شاعری پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُس میں کوئی ایپک پوئیم نہیں لیکن میں کہتا ہوں اور ثابت کرسکتا ہوں کہ یورپ کے شعرا ایپک کے لئے جو اوصاف ضروری سمجھتے ہیں وہ باستثنائے ایک کے سب ہمارے دردناک مرثیوں میں موجود ہیں۔ وہ اوصاف کیا ہیں جو ایپک میں ہونے چاہئیں اور ہمارے مرثیوں میں بھی موجود ہیں یہ میں ابھی نہ بتاؤں گا۔ وہ کون وصف ہے جو ایپک کے لئے ضروری ہے اور ہمارے مرثیوں میں نہیں ہے؟ ایک مسلسل طول طویل قصہ!! اس ضروریات کے پورا کرنے کے لئے

میں نے کمر ہمت باندھی ہے اور فی الحال کلیات میر انیس سے بند انتخاب کر کے ایک مسلسل مرثیہ جس میں میدان کربلا کا پورا حسرت خیز اور عبرت انگیز دردناک واقعہ ہو اور جو "روانگی قافلہ اہل بیت از مدینہ" سے شروع ہو اور واپسی حرم پر تمام کر دیا جائے تیار کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ مرقع جلد سج کر پبلک کے سامنے پیش ہو اور اُردو شاعری کے دلفریب چہرہ سے یہ بدنما داغ مٹ جائے کہ اس میں کوئی ایپک پوئیم نہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

غرض اردو شاعری کی حقارت اس وجہ سے کرنا کہ اُس میں وہ اصناف موجود نہیں جن کی تمہاری نظر میں آج کل وقعت ہے بالکل بیجا اور بڑی ہٹ دھرمی ہے جب ثابت ہو گیا کہ شاعری کے اصلی اور سچے جوہر تمہاری قومی زبان کی نظموں میں موجود ہیں تو اگر ڈراما اُس میں نہ ہوا تو کیا نقصان اور ایپک اُس میں موجود نہیں تو کیا ہرج ؟ میری نظر میں تو تمہارے اس اعتراض کی اُس وقت وقعت ہوتی کہ بجائے الزام دینے اور برا کہنے کے تم خود کچھ کر کے دکھاتے۔

اور اگر ڈراما تمہاری زبان میں موجود نہ تھا تو خود لکھ کر پیش کرتے اور دوسروں کو سبق پڑھاتے کہ ڈراما یوں لکھتے ہیں۔

خیر۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اگر تم میں غیرت و حمیت کا مادہ ہو تو یہیں میدان، یہیں چوگان، یہیں گوے۔ شاعری کے اسٹیج پر قدم رکھو اُردو نظم کی ترقی کے لئے کوئی عملی کارروائی کرو۔ پھر تمہارے ہر اعتراض کو ہم جان و دل سے سنیں گے اور تمہاری ہر نکتہ چینی کو نیک نیتی پر محمول کریں گے۔

بقلم
محمد امیر احمد علوی
بی۔ اے۔ لکھنؤ

عربی زبان میں مرثیہ کس شان سے کہا گیا

دنیا میں جب سے شاعری کا پتہ ملتا ہے اُسی وقت سے شاعری میں ہر قوم کے شادی و غم کے واقعات کا سراغ چلتا ہے پھر شاعری کے اخلاق و ادب کو مختلف صورتوں پر تقسیم کیا گیا ہے معشوق سے باتیں کرنے کو غزل بنائی گئی بادشاہوں کی تعریف کو قصائد کی ایجاد ہوئی۔ زندوں کی تعریف کو تقریظ سے مخصوص کیا گیا مردوں کی تعریف مرثیہ و نوحہ سے منسوب ہوئی۔ عرب کی شاعری میں اصناف شاعری کو برتا جاتا تھا اور ہر ایک کے ادب کی شان خاص تھی۔ اکثر عورتیں اپنے قبیلہ کے کسی بہادر یا مشہور شخص کے مرنے پر اُس کا نام لے کر بین کرتیں اور اُس کے مشہور واقعات کو نظم میں ادا کرتی تھیں۔ شعرائے عرب بھی اکثر مشہور فیاضوں اور بہادروں کے حالات مرثیت کی شان میں لکھتے تھے۔ ایام جاہلیت کے اکثر مرثیئے ادب کی کتابوں میں یادگار ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس سے خاص دلچسپی ظاہر کی ہے چنانچہ قبیلۂ قریش میں حضرت رسالت پناہی کے خاندان میں شاعری اور ادب کا چرچا تھا جس کی فصاحتیں تمام عرب میں بطور نمونہ تسلیم کی جاتی تھیں۔

حضرت مطّلب نے اپنی پانچ بیٹیوں سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے جیتے جی میرے مرثیئے کہو تاکہ میں اپنی نسبت ہر اک خیال سے واقف ہو جاؤں اور مرنے کے بعد کے خیالات اپنی زندگی میں سن لوں۔ چنانچہ آپ کی پانچوں بیٹیوں نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور پانچوں نے مرثیئے لکھے۔ یہ مرثیئے خواتین اسلام کے تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اُردو خوانوں کو عربی مرثیوں کو زیادہ مذاق نہیں اس لئے میں اُن کے نقل کرنے سے قلم کو روکتا ہوں۔ عرب کی شاعری

میں مرثیہ کا مفہوم چند اشعار میں ادا ہو جاتا ہے اس لئے اکثر مرثئے دس دس پندرہ پندرہ بیس بیس شعر سے زیادہ نہیں اور نہ اس قسم کی شاعری میں بتدریج کوئی جدت نظر آتی ہے بلکہ جو حالت تیرہ سو برس سے پہلے تھی وہی اب بھی قایم ہے شعراء عرب نے اُس میں کوئی خاص ترقی ظاہر نہیں کی۔

اب میں آپ کے سامنے عربی کا ایک ایسا مرثیہ پیش کرتا ہوں جو جناب مفتی میر عباس صاحب مرحوم اخباری کانپوری کی تصنیف ہے۔ مفتی صاحب کا ادب ہندوستان سے حجاز تک مسلم ہے اور وہ خود بھی میر انیس اور مرزا دبیر کے ہمعصر اور ان دونوں بزرگوں کی ترقیات کلام کو دیکھ چکے تھے۔

اور فارسی میں بھی مرثیت کے لئے کوئی خاص وضع اختیار نہیں کی گئی بلکہ قصہ و مثنوی میں جب بہ سبیل تذکرہ کسی برگزیدہ شخص کی رحلت سے افسوس کا اظہار مقصود ہوا تو اس کو چند شعروں میں ادا کر دیا گیا جیسا کہ فردوسی نے شاہنامہ میں سہراب اور رستم کی موت پر نوحہ خوانی کی ہے اور ایران کے شیعہ مسلمانوں نے بھی سبط شہید کے مراثی اور سلام اور نوحوں کو بطور غزل یا قطعہ یا مثنوی و مستزاد کے تھوڑے تھوڑے اشعار میں لکھ کر اپنے جذبات کو ختم کر دیا ہے پس عربی کی طرح فارسی میں بھی مرثیہ کہنے کے لئے کوئی خاص وضع اختیار نہیں کی گئی۔ مگر اُردو میں جناب خلیق و ضمیر نے مرثیہ کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی ابتدا کی۔ اور میر انیس اور میرزا دبیر نے اُس قالب میں وہ وسعتیں پیدا کیں جو عربی اور فارسی دونوں کے حصہ میں نہیں آئیں اور جس سے اُردو میں ایک قابل قدر اور لائق فخر ذخیرہ فراہم ہو گیا جو شمعیں عربی اور فارسی کے عالی شان ایوانوں میں فانوسوں کے اندر روشن ہوتی تھیں اُن کو میر انیس اور میرزا دبیر نے جھاڑ کی صورت میں روشن کر کے اُس کی نور فشاں روشنیوں سے بزم عالم کو روشن کر دیا اور اُردو کا دیوانخانہ

اس روشنی سے جگمگانے لگا۔

تیرہ سو برس کی شاعری میں جو انقلابات ہوئے اُن کی تصویریں مفتی صاحب کے دل پر اثر کی ہوئی تھیں۔ اس لئے اُن کا مرثیہ ایک مکمل نمونہ خیال کیا جانا چاہیے۔ اُنہوں نے عربی میں جو مرثیہ لکھا اُس کو مع اعراب اور ترجمہ کے نقل کرتا ہوں کہ اُردو خواں آسانی سے اُس کا مطالعہ کر سکیں اور اُن کی نگاہ میں عربی شان مرثیت کا ایک مقدار معین ہو جائے جس کے مقابلہ میں وہ اُردو کو دیکھ سکیں۔

مرثیہ عربی

تصنیف مفتی میر محمد عباس صاحب شوستری مرحوم

اَتیٰ شَھْرٌ یُکَابُ الدُّمُوعِ مُحَرَّمُ ۔۔۔ وَشَھْرٌ لَذِیْذُ الْعَیْشِ فِیْہِ مُحَرَّمُ

مہینہ آنسو بہانے کا یعنی محرم آ پہنچا ۔۔۔ وہ مہینہ جسمیں مومنین کیواسطے عیش لذیذ حرام ہوگیا ہے

تَنَعَّمَ فِیْہِ آلُ مَرْوَانَ فَرْحَۃً ۔۔۔ وَآلُ رَسُوْلِ اللہِ لَمْ یَتَنَعَّمُوْا

اس مہینہ میں آل مروان نے خوشی کرکے راحت پائی ۔۔۔ اور آل رسالتمآب نے راحت نہ پائی بلکہ مبتلائے مصائب ہوئے

لِآلِ اَبِیْ سُفْیَانَ دُوْرُ مَسَرَّۃٍ ۔۔۔ وَفِیْ بَیْتِ اَھْلِ الْبَیْتِ قَدْ قَامَ مَاْتَمُ

آل ابوسفیان کے گھر خوشی سے بھرے ہیں ۔۔۔ اور خانہ عصمت سرائے اہل بیت میں ماتم برپا ہے

وَسِبْطُ رَسُوْلِ اللہِ یُنْکَتُ ثَغْرُہٗ ۔۔۔ وَاَوْلَادُ حَرْبٍ ثَغْرُھُمْ تَتَبَسَّمُ

اور سبط رسول جگر گوشہ بتول کے دندان مبارک کو ٹھوکر سے ستایا جاتا ہے ۔۔۔ اور اولاد حرب کے لب و دندان تبسم کرتے ہیں

لَقَدْ قَامَ فِیْ آلِ النَّبِیِّ قِیَامَۃٌ ۔۔۔ وَعِنْدَ اَھَالِی الشَّامِ عِیْدٌ وَّمَوْسِمُ

اہل بیت رسول مختار میں تو قیامت برپا ہے ۔۔۔ اور اہل شام کے ہاں جشن عید ہے اجتماع ہے

اَهُمْ جَهِلُوا مَجْدَ الْحُسَيْنِ وَاَنْكَرُوا　　وَقَدْ عَرَفُوا مَجْدَ الْحُسَيْنِ وَاَسْلَمُوا

کیا وہ لوگ حسینؑ مظلوم کی بزرگی سے ناواقف تھے　　حالانکہ انہوں نے حسینؑ کے نانا کو خوب پہچانا اور اسلام بھی لائے

فَتَعْسًا لِقَوْمٍ جَدَّلُوهُ عَلَى الْفَلَا　　وَقَوْمٍ عَلَى شَطِّ الْفُرَاتِ تَزَاحَمُوا

پس ہلاکت ہو اُس قوم کو جنہوں نے اس امام ہمام کو دشت کربلا پر شہید کر کے ڈال دیا اور اُس قوم پر جنہوں نے کنارہ فرات پر پانی بند کر دیا

نَوَاهَا الْكُتُبُ ضَمَّنُوهَا دُعَاءَهُ　　لِيَاتِيَهُمْ مُتَبَشِّرًا اِيُهْدِ الدَّهُمْ

افسوس اُن خطوں پر جنہیں طلب اُن بیحیاؤں نے تحریر کی تھی　　تاکہ حضرت اُن لوگوں کی ہدایت سے مسرور ہو کر تشریف لائیں

نَوَافُ الْوَفَا قَدْ حَكَمَتْ الْفَهْمِيَه　　وَنُصْرَتَهُ مِنْهُمْ كُلَّ اٰوْ هَمُوا

ہزاروں خلق کی نوبت پہنچ گئی کہ وہ خطوط خبر دیتے تھے کہ یہ لوگ حضرت سے محبت رکھتے ہیں اور نصرت کرینگے اور یہ امر موہوم تھا

فَوَلَّى عَلَيْهِمْ مُسْلِمَ الْخَيْلِ عَمِّهِ　　لِيُخْبِرَهُ عَنْ سُخْطِهِمْ وَرِضَاهُمْ

پس حضرت نے اپنے ابن عم مسلم ابن عقیل کو حاکم کر کر ان لوگوں کے پاس بھیجا تاکہ حضرت کو خبر پہنچائیں اُن لوگوں کی رضا اور رضامندی

فَلَمَّا دَنَى مِنْهُمْ اَتَوْهُ تَوَدُّدًا　　وَبَايَعَهُ اَعْيَانُهُمْ وَتَرَاكَمُوا

پس جبکہ حضرت مسلم اُن لوگوں کے قریب پہنچے کمال اظہار دوستی وہ سب حاضر ہوئے اور اُنکے سردار و ہیچ مل کے بیعت کی

فَمَا لَبِثُوا اَنْ كَانَ لِلْقَوْمِ بَعْدَ ذَا　　مِنَ ابْنِ زِيَادٍ شِدَّةٌ وَتَفَاقُمُ

پس کچھ زمانہ نہ گزرا تھا کہ بعد اس بیعت کے　　ابن زیاد کی طرف سے شدت اور سختی ہوئی

وَهُمْ قَلَبُوا ظَهْرَ الْمِجَنِّ لِمُسْلِمٍ　　فَاَضْحَى وَحِيدًا اِلَى الْوِفَاقِ يُزَاحِمُ

اُن سبھوں نے حضرت مسلم سے بیعت شکنی کی اور رنگ بدل دیا پس حضرت مسلم تنہا رہ گئے کہ لوگوں نے کوچوں میں گھیر لیا

لَقَدْ نَكَثُوا عَهْدَ النَّبِيِّ وَخَالَفُوا　　وَعَهْدَ يَزِيدَ اَبْرَمُوهُ وَاَحْكَمُوا

اُن لوگوں نے رسول خدا کی بیعت کو توڑ ڈالا اور مخالفت کی اور یزید پلید کے عہد کو خوب مضبوط و استوار کیا

بِنَفْسِي اِذْ حَفُّوا بِهِ وَهُوَ قَائِمٌ　　يُقَاتِلُ مِنْ اَعْلَى الْبِنَاءِ وَيَرْجُمُ

فدا ہو جان میری اُن پر جب گھیر لیا تھا اور وہ کوٹھے پر کھڑے سے تھے اور وہ لوگ لڑتے تھے اور پتھر پھینکتے تھے اور زخم لگاتے تھے

فَکَادَ لِیُرْدِیہِمْ فَکَادُوْا اَکِیْدَتَہٗ ... بِالْاَمَانِ فَارُدُّوْہُ وَقَالُوْا اسْتَعْصِمْ

قریب تھا کہ حضرت مسلم ان سب کو ہلاک کریں کہ ان مکاروں نے امان کا حیلہ کیا اور کہا کہ تم سے اب جنگ نہ ہوگی

فَیَا لَھْفَۃً اِذْ اَمَّ ابْنُ حُمْرَانَ قَتْلَہٗ ... وَذَا صَابِرٌ مُسْتَغْفِرٌ وَمُعَظَّمُ

مقام افسوس ہے کہ ابن حمران نے قتل مسلم کا ارادہ کیا اور وہ جناب صابر تھے اور استغفار کرتے تھے

وَیَا لَھْفَۃً اِذْ اَوْصٰی ابْنَ سَعْدٍ بِرَدِّہٖ ... حُسَیْنًا وَمَنْ اَوْصَاہُ لَمْ یَکُ یَرْحَمُ

مقام افسوس ہے جبکہ وصیت کی اس بزرگوار نے ابن سعد کو کہ امام حسین کو آنے سے روکے مگر جس شخص کو وصیت کی جو بے رحم تھا

وَقَدْ خَرَجَ الْمَوْلَی الْحُسَیْنُ مُصَادِفًا ... لِیَوْمٍ جَرٰی ھٰذَا وَمَا کَانَ یَعْلَمُ

اور اتفاق یہ ہوا کہ امام حسین نے بھی اسی تاریخ مکہ سے سفر کیا جس روز یہ واقعہ کوفہ میں ہوا مگر حضرت کو خبر نہ تھی

وَلَاقَاہُ نَاسٌ بَعْدَ نَاسٍ وَاَخْبَرُوْا ... بِاَنَّکَ مِنْ کَیْدِ الْعِدٰی لَسْتَ تَسْلَمُ

اور ان جناب سے یکے بعد دیگرے لوگوں نے ملاقات کی اور خبر دی کہ آپ سفر میں دشمنوں کے مکر سے سلامت نہ رہیں گے

فَقَالَ نَعَمْ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ مَصْرَعِیْ ... وَمَصْرَعَ اَصْحَابِیْ وَاِنِّیْ لَاَعْلَمُ

حضرت نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں اپنے اور اپنے اصحاب کے قتل گاہ کو اور خوب واقف ہوں

وَلٰکِنَّ جَدِّیْ بِالرَّحِیْلِ اَشَارَ لِیْ ... وَاِنِّیْ لَمَاضٍ فِیْہِ عَزْمِیْ مُصَمَّمُ

لیکن میرے نانا رسول خدا نے مجھ سے کوچ کا اشارہ کیا ہے اور میں ضرور جاؤں گا میرا عزم اس بارہ میں مصمم ہے

فَلَمَّا اَنَاخَ الرَّحْلَ قُرْبَ زُبَالَۃٍ ... اَتٰی رَجُلٌ یَنْعٰی بِاَنْ مَاتَ مُسْلِمُ

پس جبکہ حضرت نے قریب منزل زبالہ کے اقامت فرمائی وہاں ایک شخص نے حاضر ہو کر خبر قتل مسلم پہنچائی

فَرَقَّ لَہٗ مُسْتَرْجِعًا ثُمَّ اَخْبَرَ النِّسَا ... ءَ فَقَامَتْ فِی الْخِیَامِ مَاتَمُ

حضرت نے یہ خبر سنکر انا للہ کہا اور غمگین ہوئے پھر اہل حرم کو خبر کی پس خیموں میں حضرت مسلم کا ماتم برپا ہوا

فَوَدَّعَہٗ اَھْلُ الْمَطَامِعِ وَالْھَوٰی ... وَاَسْعَدَ لَاقِیْنَ بِالسَّعَادَۃِ کُرِّمُوْا

سنتے ہی اس خبر کے جو اہل طمع اور خواہش تھے حضرت سے رخصت ہو گئے اور جو نیک بخت اور سعید تھے انہوں نے حضرت کا ساتھ نہ چھوڑا

وَقِيلَ لَهُ يَا ابْنَ الرَّسُولِ أَتَأْمَنُ   الَّذِينَ عَلَى قَتْلِ ابْنِ عَمِّكَ أَقْدَمُوا

اور حضرت کی خدمت میں کسی نے عرض کی کہ کیا آپ امن کا خیال کرتے ہیں اُن لوگوں سے جنہوں نے آپکے ابن عم کے قتل پر اقدام کیا

فَقَالَ لَهُ مُسْتَعْبِرًا مُتَرَحِّمًا   عَلَى مُسْلِمٍ وَاللّٰهِ قَدْ فَازَ مُسْلِمُ

حضرت نے آنکھوں میں آنسو بھر کے مسلم کے حال پر ترحم کر کے فرمایا قسم بخدا مسلم فائز و رستگار ہوگئے

قَضَى مَا عَلَيْهِ وَالَّذِي هُوَ لَازِمٌ   عَلَيْنَا فَبَاقٍ يُرْتَجَى وَيُتَمَّمُ

جو حق خدا انکا اُنپر اُنہوں نے اُسکو ادا کیا اور جو ہم پر لازم ہے وہ باقی ہے اسکی امید ہے اور اُسکا ارادہ ہے

فَإِنْ تَكُنِ الدُّنْيَا تُعَدُّ نَفِيسَةً   فَدَارُ ثَوَابِ اللّٰهِ أَعْلَى وَأَعْظَمُ

پس اگر دنیا عمدہ اور نفیس سمجھی جاسکے تو دار ثواب الٰہی بزرگ تر اور عظیم تر ہے

وَإِنْ تَكُنِ الْأَبْدَانُ لِلْمَوْتِ أُنْشِئَتْ   فَقَتْلُ امْرِءٍ بِالسَّيْفِ فِي اللّٰهِ أَكْرَمُ

اور جب کہ ابدان خلق موت کے لئے پیدا ہوئے ہیں تو انسان کا راہ خدا میں تلوار سے قتل ہونا بہتر ہوتا ہے

وَسَارَ وَلَمْ يَعْبَأْ بِلَوْمَةِ لَائِمٍ   لِمَا كَانَ قِدْمًا بِالشَّهَادَةِ يَحْلُمُ

پھر حضرت روانہ ہوئے اور کسی لائم کی ملامت کی طرف اعتنا نفرمائی اس لئے کہ ہمیشہ سے شہادت کا عزم بالجزم تھا

وَإِنَّ الْمُحِبَّ الصَّافِيَ الْوُدِّ يَبْتَغِي   زِيَارَةَ مَنْ يَهْوَى وَإِنْ لَامَ لُوَّمُ

اور جو دوست خالص الوداد ہوتا ہے وہ اپنے معشوق کے دیدار کا خواہاں ہوتا ہے اگرچہ ملامت کرنیوالے ملامت کریں

فَلَمَّا تَخَطَّى بِالطُّفُوفِ تَوَقَّفَتْ   الْجَوَادُ لِيَقْضِيَ أَمْرَهُ الْمُتَحَتِّمُ

پس جبکہ زمین کربلا پر پہنچے حضرت کا گھوڑا رک گیا تاکہ جو حکم محکم و مشیت خدا ہے پورا ہوجائے

فَقَالَ وَمَا اسْمُ الْأَرْضِ فَاهُوا كَرْبَلَا   فَقَالَ لَهَا شَأْنٌ خَطِيرٌ مُعَظَّمُ

اس وقت حضرت نے نام زمین پوچھا لوگوں نے عرض کی کربلا ہے فرمایا کہ اسکی شان تو بہت بلند و عظیم ہے

هُوَ الْمَقْصَدُ الْأَقْصَى مُنَاخُ رِكَابِنَا   بِذَالِكَ أَدْرَانِيَ النَّبِيُّ الْمُكَرَّمُ

یہی تو منتہائے آرزو ہے اور ہماری سواری کی اقامت کی جگہ ہے اسکی خبر دی ہے مجھکو نانا رسالتمآب نے

وَهٰذَا مَقَامٌ قَدْ بَکٰی فِیْہِ حَیْدَرٌ　　وَمِنْ قَبْلِہٖ نُوْحٌ وَحَوَّا وَآدَمُ

یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے پدر بزرگوار حیدر کرار نے گریہ کیا اور اُن سے پہلے نوح اور حوا و آدم نے

وَھٰذَا مَقَامٌ فِیْہِ سَفْکُ دِمَائِنَا　　وَلَا ضَیْرَ فَلْیُوْضَعْ ھُنَالِکَ مُخَیَّمُ

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے خون بہائے جائیں گے اور کچھ قباحت نہیں یہیں ہمارے خیمے نصب ہوں

فَلَمَّا تَبَدّٰی فِیْ ذَرَارِیْہِ وَمِنْھُمْ　　عَلِیٌّ وَعَبَّاسٌ وَعَوْنٌ وَقَاسِمُ

پس جب حضرت رونق افروز ہوئے اپنے عزیزوں کے حلقہ میں کہ انہیں علی اکبر اور عباس اور عون و قاسم تھے

وَفِیْ عُصْبَۃٍ مِنْ صَحْبِہٖ کَانَ مِنْھُمْ　　زُھَیْرُ بْنُ قَیْنٍ وَالْحَبِیْبُ وَمُسْلِمُ

اور اپنے اصحاب کے گروہ میں جن میں زہیر بن قین اور حبیب ابن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ تھے

اَضَاءَتْ عِرَاصُ الطَّفِّ مِنْہُ وَمِنْھُمْ　　کَاَنَّ ھُنَا بَدْرًا حَوَالَیْہِ اَنْجُمُ

تو اس وقت تمام زمین کربلا حضرت اور حضرت کے اصحاب و اقربا کے نور سے روشن ہو گئی گویا وہاں ماہتاب روشن تھا جس کے گرد ستارے تھے

فَنَادٰی لِاَھْلِ الشَّامِ ھَلْ تَعْرِفُوْنَنِیْ　　فَجَدِّیْ نَبِیٌّ لِلرِّسَالَۃِ خَاتِمُ

پھر حضرت نے اہل شام کو ندا دی کہ آیا تم مجکو جانتے ہو میرے نانا وہ نبی ہیں جن پر رسالت کا خاتمہ ہوا

وَاِنَّ عَلِیًّا وَالِدِیْ اَفْضَلُ الْوَرٰی　　وَاَکْثَرُھُمْ حِلْمًا وَعِلْمًا وَاَعْظَمُ

اور علی ابن ابی طالب میرے والد ہیں جو بہترین خلق ہیں اور سب اصحاب سے علم و حلم میں زیادہ اور بزرگتر ہیں

وَجَعْفَرُ الطَّیَّارُ عَمِّیْ وَجَدَّتِیْ　　خَدِیْجَۃُ الْکُبْرٰی وَاُمِّیْ فَاطِمُ

اور جعفر طیار میرے چچا ہیں اور خدیجۃ الکبریٰ میری نانی ہیں اور فاطمہ زہرا میری مادر گرامی ہیں

وَسَیْفُ رَسُوْلِ اللّٰہِ سَیْفِیْ وَھٰذِہٖ　　عِمَامَتُہٗ اِنِّیْ بِھَا مُتَعَمِّمُ

اور میرے پاس جو تلوار ہے وہ سیف رسول خدا ہے اور یہ عمامہ بھی انہیں کا ہے جسے میں اپنے سر پر رکھے ہوں

فَقَالُوْا نَعَمْ اَنْتَ ابْنُ اَحْمَدَ بَعْدَہٗ　　اَنَّکَ الْیَوْمَ مَقْتُوْلٌ فَمَا تَتَکَلَّمُ

جواب دیا ان بےحیاؤں نے کہ ہاں آپ فرزند رسول ہیں مگر آج تو آپ قتل کئے جائیں گے پھر جو آپ فرماتے ہیں بیہودہ ہے

هنالك اصحاب الحسين تسابقوا　　　　ووَدّع بعضًا بعضهم يتقدّم

اسوقت تو اصحاب حسین بیتاب ہوگئے اور شوق جہاد میں تڑپنے لگے اور آپس میں ایک دوسرے سے رخصت ہوکر پیشقدمی شروع کی

ففازوا بجنات النعيم تشوّقا　　　　ولم يك فيهم واحدٌ يتألّم

پس وہ بمقتضائے شوق فائز بجنات نعیم ہوئے اور کوئی اُن میں ایسا نہ تھا جسکو غم والم اور اندوہ ہو

ولكن وجوهًا مشرقات نواضرٌ　　　　عليها من الهيجاء غيمٌ مغمّم

بلکہ سب کے چہرے چمکتے تھے خوشی میں اور تر و تازہ تھے کہ اُن پر غبار معرکہ کا ایک ابر سایہ فگن تھا پُر آب

وكان يرى النقصان فيهم بواحدٍ　　　　ولم يك جند الشام بالالف يهزم

اور وہ اتنے کم تھے کہ ایک کا نقصان سو انہیں نقصان معلوم ہوجاتا تھا اور لشکر شام ہزار کے مرنے سے بھی شکست کھاتا تھا

ولمّا طفا اصحابه بقضيضهم　　　　ترخّص منه اهله وتقدّموا

اور جبکہ اصحاب حسین مظلوم سب شہید ہوچکے اسوقت حضرت کے عزیزوں نے رخصت لی اور جہاد کے لیے آئے

فجاء غلامٌ يخجل الشمس وجهه　　　　حقيق بان يدعى له حين يسلّم

تا اینکہ ایک صاحبزادہ برآمد ہوا جسکا چہرہ آفتاب کو خجل کرتا تھا لائق اسکے کہ جب اسکو دیکھیں اسکے حق میں دعائے خیر کریں

فوجّهه نحو العدى اذ اراد مشيه　　　　الى الجند ظمآنًا بيمناه مخذم

حضرت نے اسکو جنگ کی طرف بھیجا مگر جب وہ لشکر شام کی طرف تشنہ کام ہاتھ میں شمشیر لیکر روانہ ہوا

رآه ابوه الطهر نظرة آيسٍ　　　　وارخى عيونًا وهو الغيظ يكظم

تو پدر بزرگوار نے نظر یاس سے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھوں کو جھکا لیا اور غم و غصہ کو ضبط کیا

فقاتل ابطالًا وعاد الى ابيه　　　　يشكوا اوام القتال ماقم

پھر اُس صاحبزادہ نے بہادروں سے جہاد کیا اور پلٹے اپنے باپ کی خدمت میں آکر پیاس کی شکایت کی اور جنگ سے پیاس بڑھ جاتی ہے

فقال له ويلاه من اين اسقيك　　　　ماءً ولكنّ الاذى متصرّم

جواب دیا اُن حضرت نے کہ افسوس پانی کہاں سے پلاؤں مگر یہ مصیبت جلد تمام ہوجائیگی

ستلقى وشيكاً جدك الطهر فانتظر ‏ ‏ ‏ فيسقيك ماءً منه ريك دائم

عنقریب اپنے جد بزرگوار سے تم ملاقات کروگے اور ان کا انتظار کرو کہ وہ تم کو ایسا پانی پلائیں جس سے ہمیشہ سیراب ہو

فآب اليهم ثم شد عليهم ‏ ‏ ‏ فظللت له اهل القتال تغمغم

پھر اس صاحبزادے نے رجوع کی لشکر کی طرف اور ان پر حملہ کیا اور اہل جنگ نے اس کی جانب نعرے کرنے شروع کئے

الى ان رماه منقذ فدعا الحسين ‏ ‏ ‏ ان هنا جدي عليك يسلم

تا اینکہ منقذ ملعون نے ایک تیر مارا، ابن علی اکبر نے امام حسین کو پکارا کہ میرے جد بزرگوار یہاں آ گئے ہیں آپ پر سلام کرتے ہیں

ومات فلاقاها الحسين مرملا ‏ ‏ ‏ طريحا على الرمضاء لا يتكلم

یہ کہہ کر انتقال کیا اور امام حسینؑ نے آکر خاک پر غلطاں پایا کہ زبان بھی اس نوجوان کی بند تھی

فقال على دنياكم بعده العفا ‏ ‏ ‏ وويل لكم يا قوم مما فعلتم

پھر فرمایا کہ بعد ایسے فرزند کے تمہاری دنیا پر خاک ہے اور وائے ہو اے قوم نابکار تم پر اس ظلم و ستم پر

وجاءت اليه زينب من خيامها ‏ ‏ ‏ اكبت عليه وهي للوجه تلطم

اسکے بعد حضرت زینب بیتابانہ خیمہ سے نکلکر وہاں تک آئیں اور نعش پر اپنے تئیں گرا دیا اور منہ پر طمانچے مارتی تھیں

فبارز كل واحد بعد واحد ‏ ‏ ‏ ومن ربهم اجراً عظيماً تقاسموا

اسی طرح ہر ایک بعد ایک کے جہاد کو نکلا اور اپنے پروردگار سے اجر عظیم لے کر باہم تقسیم کیا

بنفسي شفاه ذابلات من الصدى ‏ ‏ ‏ تسبح للرحمن حين تكلم

فدا ہو میری جان ان لبوں پر جو پیاس سے خشک ہوگئے اور جب کلام کرتے تھے تسبیح خدا کرتے تھے

بنفسي جباه داميات تعفرت ‏ ‏ ‏ وكم سجدت لله والليل مظلم

فدا ہو جان میری ان پیشانیوں پر جو خون آلودہ ہو کر خاک میں بھر گئیں اور کسقدر شب تاریک میں سجدۂ خدا میں مشغول رہیں

ثلث ليال قد مضين على الولا ‏ ‏ ‏ باياماها والماء عليهم محرم

تین راتیں پیاسے مع دنوں کے گزر گئیں کہ پانی ان پر گویا حرام ہو گیا تھا

إذا التمسوا منهم من الماء جرعة ... دعوهم إلى نار من الحرب أضرموا

جس وقت اُن ملاعین سے پانی کا ایک گھونٹ مانگتے تھے تو وہ آتش حرب کی طرف جسکو روشن کیا تھا طلب کرتے تھے

فلمّا مضى أعوانه لسبيلهم ... ولم يبق منهم واحد يتقدم

پس جب کہ انصار حضرت کے سب درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور کوئی باقی نہ رہا جو جہاد کرتا

فنادى حسين وهو ينظر حوله ... وما حوله إلا القنا والصوارم

اس وقت حضرت امام حسینؑ نے ہر طرف نظر کی اور سوا نیزہ و شمشیر کے کچھ نہ دیکھا پس ندا کی فریاد کی

فقال ألا فيكم محب يحبنا ... ألا ذابّ عنا يحامي ويرحم

اور کہا کہ تم میں کوئی ایسا ہے جو ہمارا دوست ہو کوئی ایسا ہے جو رحم کھا کر ہماری حمایت کرے

وهل من مغيث أو معين يعيننا ... ويرجو من الرحمن ما هو أدوم

آیا کوئی فریادرس یا معین ہے جو ہماری اعانت کرے اور خدا سے اس نعمت کا امیدوار ہو جو دائمی ہے

فسالت دموع لو تراها لخلتها ... قلائد درّ في الحصى تتقصم

اسوقت آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے کہ اگر تو دیکھے تو خیال کرے کہ موتی کے گلوبند سنگریزوں میں پوشیدہ ہو گئے ہیں

بنات علي باكيات صوارخ ... دعون ثبورا والطغام تزاحموا

اور دختر حیدر کرار گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کرتی تھیں اور واویلا کرتی تھیں اور اہل شام ہجوم کئے ہوئے تھے

فكرّ ففرّوا خائفين كأنهم ... ثعالب فيهم ما بينها جاس ضيغم

پس حضرت نے حملہ کیا اور اعدا خوف سے بھاگے گویا وہ سب روباہ تھے کہ ایک شیر ژیان آگیا تھا

ولم ير مكسورا وحيدا من الأنام ... أربط جأشا منه قطّ وأقوم

مگر حضرت باوجود زخموں کے اور تنہائی کے ایسے مستقل اور پُردل تھے کہ کوئی مثل حضرت کے دیکھا نہیں گیا

بنفسي طفل قد رماه ابن كاهل ... رضيعا عطشانا وما كاد يفطم

فدا ہو جان میری اُس بچۂ شیرخوار تشنہ کام پر جسکو حرملہ بن کاہل نے نشانہ تیر ظلم کیا حالانکہ ابھی دودھ بھی نہیں چھٹا تھا

وَلَهفِي لِسَهمٍ سَمَّهُ القَومُ قَد اَصَابَ   قَلبَ اِمَامٍ قَلبُهُ مُتَقَسَّمُ

اور افسوس اُس تیر پر جسکو قوم نے زہر میں بجھایا تھا اور وہ آکر امام کے دل پر پڑا جسکا دل غم سے پارہ پارہ تھا

فَاَخرَجَهُ مِن ظَهرِهِ وَلَئِن تَرىٰ   تَخَلَّت مِنَ المِيزَابِ يَنبَعِثُ الدَّمُ

اُس تیر سے پہلو کو حضرت کے پشت کی طرف سے نکالا اور مثل پرنالہ کے خون اُس زخم سے جاری ہوا

فَاَصبَحَ مَولَانَا الحُسَينُ كَقُنفُذٍ   عَلَيهِ جِرَاحَاتٌ بِهَا الدِّينُ يَثلَمُ

پس حضرت امام حسین مثل ساہی کے ہوگئے بسبب کثرت تیروں کے اور حضرت پر وہ زخم تھے جس سے دین میں رخنہ پڑ جائے

وَشَمَّرَ شِمرٌ اَو سِنَانٌ بِقَتلِهِ   فَاَحدَثَ مَا عَن ذِكرِهِ اَنَا تَمُّ

اور بنا بر اختلاف روایت کے شمر یا سنان ملعون مستعد ہوگیا حضرت کے قتل پر اور وہ ظلم کیا جسکے ذکر کی مجکو تاب نہیں

فَحِينَئِذٍ قَد نَاحَتِ الجِنُّ فِي الفَلَا   وَرَنَّ حَمَامٌ كَانَ قَبلُ يُرَنِّمُ

پس اُس وقت قوم جن نے بیابان میں نوحہ کیا اور وہ کبوتر جو ترنم کرتے تھے حضرت کے غم میں گریاں ہوئے

وَهَبَّت رِيَاحٌ عَاصِفَاتٌ خِلَالَهَا   غُبَارٌ شَدِيدٌ لَا يُسَاوِيهِ عِظلَمُ

اور وہ ہوائیں تند چلیں جن میں غبار شدید تھا کہ تاریکی شب سے اُس کی تاریکی زیادہ تھی

وَاَظلَمَتِ الآفَاقُ وَانكَسَفَ الذُّكَا   عَجِبتُ بَدَت وَقتَ الظَّهِيرَةِ اَنجُمُ

اور تمام آفاق تیرہ و تار ہوگئے اور آفتاب کو گہن لگ گیا تا اینکہ وقت دوپہر کے ستارے نکل آئے

وَاَصبَحَتِ الجُدرَانُ حُمرًا كَاَنَّهَا   مَلَاحِفُ مُطلًى عَلَيهِنَّ عَندَمُ

اور دیواریں ایسی سرخ ہوگئیں گویا کہ وہ چادریں تھیں جن پر سرخ رنگ تیز تھا

وَاَثَّرَ فِي البَيتِ المُقَدَّسِ غَمُّهُ   فَسَالَ مِنَ الاَحجَارِ دُرٌّ فَتَادَمُ

اور بیت المقدس میں بھی حضرت کے غم و ماتم نے اثر دکھایا کہ جو پتھر اُٹھایا گیا اُسکے نیچے سے خون تازہ نکلا

وَقَد اَخَذُوا بَعضَ الجِمَالِ فَذَبَّحُوا   فَذَاقُوهُ مَطبُوخًا اِذَا هُوَ عَلقَمُ

اور لوگوں نے ایک اونٹ کو ذبح کیا پکڑ کر اور اُس کو پکا کر کھایا تو اُسکا گوشت مانند زہر کے تلخ پایا

وَلَا غَرْوَ مِنْ تِلْكَ الْعَزَائِمِ اِذْ بَدَتْ　　فَاِنَّ مُصَابَ الطُّهْرِ اَدْهٰى وَاَفْخَمُ

اور کیا تعجب کا مقام ہے ان امور عظیمہ پر جو ظاہر ہوئے اسلئے کہ مصیبت امام پاکیزہ کی نہایت بڑی مصیبت ہے

فَاَیُّ دَمٍ قَدْ اَهْرَقَتْهُ سُيُوْفُهُمْ　　وَاَیُّ شَنِيْعٍ قَارَفُوْهُ وَاَجْرَمُوْا

کس خون کو اُن ملعونوں کی تلواروں نے بہایا　　اور کونسا گناہ عظیم عمل میں لائے اور ظاہر کیا

وَلِلّٰهِ مَنْ صُبَّتْ عَلَيْهِ مَصَائِبٌ　　يَكِلُّ الْفَتٰى عَنْ ذِكْرِهِنَّ وَيُحْجِمُ

کیا مرتبہ ہے پیش خدا اُسکا جس پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ آدمی اُس کے ذکر سے تھک جائے اور عاجز آ جائے

وَمَا كُنْتُ اَنْسٰى حِيْنَ عَادَ جَوَادُهٗ　　اِلٰى بَابِ فُسْطَاطِ النِّسَاءِ يُحَمْحِمُ

اور میں نہیں بھولتا جب کہ حضرت کا ذوالجناح　　دروازۂ خیمۂ اہل حرم پر ہمہمہ کرتا ہوا گریاں آیا

فَشَاهَدْنَهٗ وَالسَّرْجُ عَارٍ وَظَهْرُهٗ　　جَرِيْحٌ بِسِهَامٍ مِنْهُ يَنْسَكِبُ الدَّمُ

اور اہل حرم نے دیکھا کہ زین خالی ہے اور اُس کی پشت تیروں سے زخمی ہے اور اُس سے خون جاری ہے

فَكَمْ مِنْ جُيُوْبٍ لِلْكَرَائِمِ شُقِّقَتْ　　وَكَمْ مِنْ خُدُوْدٍ كَانَتِ الْيَوْمَ تُلْطَمُ

پس کتنے گریبان اُسکو دیکھکر اُن بے وارثوں کے پارہ پارہ ہوئے اور کتنے رخسار تھے جن پر اُنھوں نے غم میں طمانچے لگائے

وَحِيْنَ خِيَامُ الْفَاطِمِيَّاتِ اُحْرِقَتْ　　وَفِيْهَا اللِّئَامُ الْغَاشِمُوْنَ تَقَحَّمُوْا

اور اُس وقت کو نہیں بھولتا ہوں جبکہ دختران فاطمہ کے خیموں میں آگ لگا دی گئی اور اہل ظلم ویرانہ اُن خیموں میں در آئے

وَاُخْرِجَتِ النِّسْوَانُ عَنْهَا حَوَاسِرًا　　فَشَاهَدْنَ فِي الرَّمْضَاءِ مَا هُوَ يُؤْلِمُ

اور وہ مخدرات عصمت اُن خیموں سے برہنہ سر نکالی گئیں اور جلتی ریت پر ایسا کچھ دیکھا جس سے دل دردناک ہو

حُسَيْنٌ جَرِيْحٌ بِالدِّمَاءِ مُضَرَّجٌ　　وَمَا لِلْجِرَاحَاتِ اَصَابَتْهُ مَرْهَمُ

دیکھا کہ امام حسینؑ زخمی و آغشتہ بخون ہیں اور جو زخم کہ حضرت کو پہنچے اُنکے لئے دوا ہے نہ مرہم

حُسَيْنٌ ذَبِيْحٌ بِالْعَرَاءِ مُرَمَّلٌ　　مُحَنَّطُهٗ تُرْبٌ وَغَاسِلُهٗ دَمٌ

امام حسینؑ میدان کربلا میں خاک آلودہ ہیں کہ حنوط حضرت کا مٹی ہے اور آب غسل خون ہے

بِهِ قُتِلَ الْاِسْلَامُ وَالدِّيْنُ وَالتُّقٰى ۔ وَتَبْكِيْهِ بِالْبَطْحَاءِ خَيْفٌ وَزَمْزَمُ

حضرت کے قتل سے اسلام اور دین اور تقوےٰ قتل ہوگیا اور اُن پر خیف اور زمزم مکہ میں گریاں ہے

اَيَا سَاكِنِيْ بِشَامٍ وَيَا اَهْلَ كُوْفَةٍ ۔ اَهٰكَذَا اَوْصَى النَّبِيُّ الْمُكَرَّمُ

اے ساکنانِ شام اور اے اہل کوفہ کیا رسالت مآب نے تم کو یہی وصیت فرمائی تھی

ءَاَشْرَبْتُمُوْا مَاءَ الْفُرَاتِ خُيُوْلَكُمْ ۔ وَاَوْلَادُ طٰهٰ لِلصَّلٰوةِ تَيَمَّمُوْا

کہ تم نے اب فرات سے اپنے گھوڑوں تک کو سیراب کیا اور اولاد رسول نے سامنے فرات کے نماز کیلئے تیمم کیا

وَيَا وَيْلَكُمْ تُسْبٰى بَنَاتُ مُحَمَّدٍ ۔ كَاَنَّ عَبِيْدُهَا تُرْكٌ وَزَنْجٌ وَدَيْلَمُ

وائے ہو تم پر دختران محمد مصطفےٰ کو تم نے اسطرح مقید کیا کہ گویا بندی اُنکی مثل بندی ترک و زنگ دیلم کی تھے

تَسُوْقُوْنَ زَيْنَ الْعَابِدِيْنَ مُصَفَّدًا ۔ وَفِيْ قَدَمَيْهِ شَوْكَةٌ وَتَوَرُّمُ

امام زین العابدین کو تم اس طرح قید میں جکڑ کر لے گئے کہ اُن کے پاؤں میں کانٹے تھے اور ورم

تُدَارُ رُؤُوْسُ الْاَطْيَبِيْنَ عَلَى الْقَنَا ۔ وَلَا مُنْكِرٌ فِيْكُمْ وَلَا مُتَاَلِّمُ

ان بزرگواران پاک و پاکیزہ کے سر نیزوں پر پھرائے جاتے ہیں اور تم میں کوئی اس امر شنیع کو برا نہیں جانتا اور نہ غمگین ہوتا ہے

بِاَيَّةِ عَيْنٍ تَنْظُرُوْنَ اِلَى النَّبِيِّ ۔ حِيْنَ يُنَادِيْ وَيْلَكُمْ مَا صَنَعْتُمُ

کس آنکھ سے تم رسولخدا کی طرف دیکھو گے جس وقت روز قیامت تمہیں پکاریں گے کہ وائے ہو تم پر تم نے میری اولاد کے ساتھ کیا کیا

قَتَلْتُمْ حُسَيْنًا لِاسْتِطَابَةِ فَاسِقٍ ۔ وَعَمَّا قَرِيْبٍ تَنْدَمُوْنَ وَتَنْدَمُ

اور فرمائیں گے کہ تم نے میرے حسین کو ایک فاسق کی خوشی کے لئے قتل کر ڈالا اور عنقریب تم اور وہ سب نادم ہوگے

قَرَيْتُمْ كَبُوْدِيْ وَارْتَجَيْتُمْ شَفَاعَتِيْ ۔ وَاِنَّ جَزَا الظَّالِمِيْنَ جَهَنَّمُ

تم نے میرے پارۂ جگر کو قطع کیا اور پھر شفاعت کے امیدوار ہو اور ظالم کی جزا تو دوزخ ہے

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ عَلَيْهِمُ ۔ جَمِيْعًا وَسُخْطُ اللّٰهِ اَخْزٰى وَاَعْظَمُ

لعنت ہو خدائے غالب کی اُن سب پر ۔ اور عذاب خدا نہایت عظیم اور رسوا کنندہ ہے

أَعَبَّاسُ مَهْلاً فَالْمَصَائِبُ جَمَّةٌ فَلَمْ يُحْصِيهَا نَثْرٌ وَلَا هِيَ تَنْتَظِمُ

اے عباس قلم کو روک کہ مصائب بے انتہا ہیں نہ تو انکا نثر میں احاطہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ نظم ہو سکتے ہیں

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ أَهْلَ بَيْتِ رِسَالَةٍ بِكُمْ بُدِءَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَخُتِمُ

اے اہل بیت رسالت تم پر سلام ہو تم سے ابتدا ہے ذکر حکیم کی اور تمہیں پر خاتمہ ہے

کلام فارسی

عربی کی طرح فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا میدان بہت تنگ نظر آتا ہے۔ وہی دس دس بیس بیس شعر کے قطعہ یا محدود مثنوی میں واقعات اور جذبات کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عجمی نہایت ذہین و زیرک ہوتے ہیں اور سیکڑوں برس سے مذہب شیعہ وہاں حکمرانی کر رہا ہے لیکن میدانِ مرثیت نے زیادہ کشائیش حاصل نہیں کی۔ ہاں دوسرے اصناف سخن میں بڑے بڑے زبردست شاعر اور سخن آفریں نظر آتے ہیں جن پر ایران فخر کر رہا ہے۔ جیسے فردوسی، نظامی وغیرہ

میرا ارادہ تھا کہ شاہنامہ فردوسی و سکندر نامہ نظامی و حملہ حیدری ملا بمون علی کرمانی و حملہ حیدری ملا رفیع باذل و صولت فاروقی میں سے چند لڑائیاں لکھ کر ہر لڑائی کے مقابلہ میں میر انیس کے اندازِ جنگ کو دکھایا جائے تاکہ دیکھنے والے دیکھ سکیں کہ سخن طرازانِ فارسی کے مقابلہ میں سخن طراز اُردو نے کیا کام کیا ہے اور فارسی اور اُردو کے میدانِ جنگ میں کس آن بان سے لڑتے ہیں کس گھمسان کی لڑائی ہو رہی اور کس غضب کی تلوار چل رہی ہے۔ کون کس حربے سے کام لے رہا ہے لیکن میرے گریجویٹ دوستوں نے کہا کہ زمانہ اس ثروت نگاہی کی داد دینے کو تیار نہیں۔ اُردو خواں دنیا

میں فی صدی پانچ بھی ایسے موازنہ سے دلچسپی ظاہر کرنے والے نہیں۔ اس لئے میں اس خیال کو نہایت محدود طور سے ظاہر کرتا ہوں۔

ناظرین ہر مقام کے طرزِ کلام کو دیکھیں کہ فارسی میں کس بات کو کن لفظوں میں ادا کیا گیا ہے اور میر انیس نے اسی بات کو کس رنگ سے مرقع تصویر بنایا ہے۔

جنگ دارا و سکندر

نظامی سکندر نامہ میں لکھتے ہیں ؎

رسیدند لشکر بجائے مصاف — دو پرکار[1] بستند چوں کوہ قاف
خسک[کوکھرو ۱۲] برگزرگاہ کیں ریختند — نقیباں خروشیدن انگیختند
ز سُمِّ ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شش[2] شد و آسماں گشت ہشت
سپہدار ایراں ہم از صبح بام — برآراست لشکر بسازِ تمام
نخستیں صفِ میمنہ ساز کرد — ز تیغ اژدہا را دہن باز کرد
صفِ میسرہ ہم برآراست چست — یکے کوہ گفتی ز پولاد رست
جناح آں چناں بست در پیش گاہ — کہ پوشیدہ شد روئے خورشید و ماہ
ز قلبے کہ چوں کوہ پولاد بود — پناہندہ را قلعہ آباد بود
ز دیگر طرف لشکر آرائے روم — برآراست لشکر چو نخلے ز موم
چپ و راست آراستہ از ترک و تیغ — چو آرایشِ گلبن از اشک میغ
پس و پیش را کرد چوں خار کوہ — برانگیخت قلبِ ثریا شکوہ
چو از ہر دو سو لشکر آراستند — یلاں سو بسو ہم دمی خواستند
ز شمشیر برگشتہ جائے نبود — کہ در عرصہ را اژدہائے نبود

[1] دو پرکار یعنی دو حلقہ ۱۲ [2] یعنی یک طبق خاک بر آسمان رفت ۱۲

نهنگِ خدنگ از کمینِ کمان — نیاسود بر یک زمیں یک زمان
کمند اژدہاے مسلسل شکنج — دہن باز کردہ بتاراجِ گنج
چناں گرم شد آتشِ کارزار — کہ از نعل اسپاں برآمد شرار
دریں سو سکندر ز شمشیر تیز — برانگیختہ از جہاں رستخیز
و دوستی چپتاں میگزارید تیغ — کزو خصم را جاں نیاید دریغ
چو بر فرقِ پیل آمدے خنجرش — فرو ریختے زیر پایش سرش
چو بر آب دریا غضب ریختے — ز دریاے آب آتش انگیختے
چو شیر یکہ آتش ز دم بر زند — دم باد پارا بہم بر زند

آگے بڑھ کر گھمسان کی لڑائی میں لکھتے ہیں ۵

برآمد ز قلبِ دو لشکر خروش — رسید آسماں را قیامت بگوش (شورِ قیامت)
تبیرہ (نقارہ) بغرید چوں تند شیر — درآمد برقص اژدہاے دلیر
ز شوریدنِ نالۂ کرناے نیز — برافتاد تب لرزہ بر دست و پاے
ز فریاد روئینہ خم (نقارہ) از پشتِ پیل — نفیرِ نہنگاں برآمد ز نیل
ز بس بانگِ شیپور زہرہ شگاف — بدرید زہرہ بپیچید ناف
ز غریدنِ کوس خالی دماغ — زمیں لرزہ افتاد در کوہ و راغ
ز بس تیر باراں کہ آید بجوش — فگندہ ابر بارانی خود ز دوش
خروشیدنِ کوس روئینہ طاس — نیوشندہ را دادہ بر جاں ہراس
سناں بر دستاں رستہ چوں نوکِ خار — سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار
گریزندگاں را دراں رستخیز — نہ روے رہائی نہ راہِ گریز
کسی از خاصگاں پیش دارا نبود — گروہ در دل کس مدارا نبود
دو سرہنگ نامدار چوں پیل مست — برآں سلیتین برکشادند دست

درافتاد دارا ایراں ز خشم تیز
ز گیتی برآمد یکے رستخیز

درخت کیانی در آمد بخاک
بغلطید در خون تن زخمناک

نمونہ کلام فردوسی از شاہنامہ

رزم شاہ کاؤس بادشاہ مازندراں

یکے نامدارے ز مازندراں
بگردن برآوردہ گرز گراں

کہ جویا بدش نام و جوینده بود
گراینده گرز و گوینده بود

عناں را بپیچید برخاست گرد
زبانگش بلرزید دشت نبرد

نشد ہیچکس پیش جویا بروں
ز گرداں بجنبید گوئی نہ خوں

بآواز گفت آں زماں شہریار
چہ بود اے دلیراں و مرداں کار

کزیں دیو دلتاں چنیں خیرہ شد
از آواز او رویتاں تیرہ شد

ندادند پاسخ دلیراں بشاہ
زجویا بپژمرد گفتی سپاہ

یکے برگرائیدہ رستم عناں
بگردن برآورد رخشاں سناں

بآوردگہ رفت چوں پیل مست
پلنگے بزیر اژدہائے بدست

بجویا چنیں گفت کے بدنشاں
نیفگنده نامت ز گردن کشاں

نگر بدترا آنکہ زاینده بود
فزاینده بود ار گزاینده بود

بدو گفت گویا کہ ایمن مشو
زجویا و از خنجر سرورو

کہ اکنوں بدرّد جگر مادرت
نگرید براین جوشن و مغفرت

چو رستم شنید ایں سخنہا تمام
برآورد یک نعرہ و گفت نام

گریزاں شد آں پہلوان دلیر
تہمتن بغرید مانندِ شیر

پس پشت او اندر آمد چو گرد بُز
سناں بر کمر بند او راست کرد

بود نیزہ بر بند درع و زرہ
زرہ را نماند ہیچ بند و گرہ

بینداخت از پشتِ اسپش بخاک
دہن پر ز خاک و زرہ چاک چاک

بفرمود سالارِ مازندراں
بیک سر سپاہ از کراں تا کراں

کہ سر بر فرازید و جنگ آورید
ہمہ راہ و رسمِ پلنگ آورید

بکینہ ازاں لشکرِ بے شمار
فراواں بیامد سوئے کارزار

سپہدار ایراں چو زاں گونہ دید
ز جا اندر آمد چناں چوں سزید

برآمد ز ہر دو سپہ بوق و کوس
ہوا نیلگوں شد زمیں آبنوس

ہمہ یکسرہ تیغِ کیں آختند
بہم بگراں اندر انداختند

چو برق درخشندہ از تیرہ میغ
ہمی آتش افروخت از گرز و تیغ

ہوا گشت سرخ و سیاہ و بنفش
ز بس نیزہ و گونہ گونہ درفش

زمیں شد بکردار دریائے قیر
ہمہ موج جوش از خنجر و گرز و تیر

از آوازِ دیوان و از تیرہ گرد
ز غریدن کوس و اسپ نبرد

شکافید کوہ و زمیں بر درید
بدانگونہ پیکار کیں کس ندید

پر آواز رعدست گفتی چناں
دیا روز در تیرہ شب شد نہاں

چکاکاک گرز آمد و تیغ تیر
ز خونِ یلاں گشت دشت آبگیر

جہاں یکسرہ ہمچو دریا نمود
نہنگ اندر او گرز و شمشیر بود

سواراں چو کشتی رواں اندر او
بر و دست اندر آورد از کینہ رو

ہمی گرز بارید بر خود و ترگ
چو باد خزاں بارد از نخل برگ

فراواں سر افتاد مانند گوئے
دل و سینہ ہا چاک و خوں بد بجوئے

سپہدار رستم یلِ صف‌شکن ۔ ابا جاں‌ستاں تیغ دشمن‌فگن

نشستہ برخشش اندراں ہمچو کوہ ۔ درافگندہ تن را بدیواں گروہ

ز بارہ چو بگزاروسے تیغ تیز ۔ ز دیواں برآوردسے اورستخیز

بیک زخم دہ سر فگندسے ز دوش ۔ بنعرہ بکندسے دلِ شیر روش

ز گرزش دلِ آسماں چاک شد ۔ ز گردش فلک روسے برخاک شد

خدنگش چو از شست کردی گزر ۔ ہراساں شدسے زال دلِ شیر نر

کمندش چو تن راست کردی بخم ۔ چو اژدر کشیدسے یلاں را بہ دم

ز باورکابش جہاں خیرہ ماند ۔ ز تیغش زمیں دیدہ درخوں نشاند

بدیں گونہ زاں لشکرِ نامدار ۔ فراواں بیفگندہ در کارزار

جنگ رستم با افراسیاب

دماں رفت تا سوسے توراں سپاہ ۔ یکے نعرہ زد شیر لشکر پناہ

چو افراسیابش بہاموں بدید ۔ شگفتید زاں کودکِ نارسید

ز گرداں بپرسید کایں اژدہا ۔ بدینگونہ از بند گشتہ رہا

کدام است کایں را ندانم بنام ۔ یکے گفت ایں پورِ دستانِ سام

بود رستمش نام و بس سرکش است ۔ کہ جنگے و چوں آب و چوں آتش است

بہ پیشِ سپہ آمد افراسیاب ۔ چو کشتی کہ موجش برآرد ز آب

چو رستم ورا دید بفشرد راں ۔ بگردن برآورد گرزِ گراں

چو افراسیابش بدانگونہ دید ۔ بزد چنگ و تیغ از میاں برکشید

زمانے بکوشید با پورِ زال ۔ تہمتن برافراختہ چنگ و یال

بہ بندِ کمرش اندر آویخت چنگ ۔ جدا کردش از پشت زینِ خدنگ

همی خواست بردن بہ پیشِ قباد
دهد جنگ روز نخستینش یاد

ز هنگ سپهدار و جنگِ سوار
نیامد دوالِ کمر پایدار

گسستہ بخاک اندر آمد سرش
سواران گرفتند گرد اندرش

تهمتن فرو برد چنگِ دراز
ربود از سرش تاج آں سرفراز

بیک دست رستم کمر مانده بود
بدستِ دگر تاجش از سر ربود

یکے مژده بردند نزدیک شاه
کہ رستم بدرید قلبِ سپاه

بہ نزدِ سپهدار ترکاں رسید
درفشش سپهدار شد ناپدید

گرفتش کمربند و افگند خوار
خروشے برآمد ز ترکاں بزار

چو ایں مژده بشنید از او کیقباد
بفرمود تا لشکرش همچو باد

بیکبار بر خیل توراں زنند
برو بیخ ایشاں ز بن بر کنند

ز جاے اندر آمد چو آتش قباد
بجنبید لشکر چو دریا ز باد

برآمد خروشیدنِ دار و گیر
درخشیدنِ خنجر و تیغ و تیر

برآں ترگ زریں و زریں سپر
عیاں گشت از چاک چاکِ تبر

توگفتی کہ ابرے برآمد ز گنج
ز شنگرف نیرنگ زد بر ترنج

دو لشکر بیک دیگر آویختند
توگفتی بهم اندر آمیختند

غریویدنِ مرد و غرنده کوس
همی کرد بر رعدِ غراں فسوس

ز آسیبِ شیرانِ پولاد چنگ
دریده دلِ شیر و چرمِ پلنگ

زمیں کرده بد سرخ رستم بجنگ
یکے گرزهٔ گاو پیکر بچنگ

بهر سو کہ مرکب برانگیختے
چو برگِ خزاں سر فرو ریختے

بشمشیر براں چو بگذاشت دست
سرِ سرفرازاں همی کرد پست

اگر بر زدے بر سرانِ سرفراز
بدو نیمہ کردیش با اسپ و ساز

چو شمشیر بر گردن افراختے — چو کوه از سواران سر انداختے
ز خون دلیران بدشت اندرون — چو دریا زمیں موج زن شد ز خون
همہ روئے صحرا سر و دست و پائے — بہ زیر سم اسپ جنگ آزمائے
ز سم ستوران دران پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
فرو رفت و بر رفت روز نبرد — بماہی نم خون و بر ماه گرد
بروز نبرد آں یل ارجمند — بشمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و بست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

ترکی سے اُردو کا مقابلہ

ترکی اور اُردو ایک ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ اور دونوں کے مدارج ترقی بھی قریب قریب زمانے کے پائے جاتے ہیں۔ ترکی نے استنبول میں سلاطین عثمانیہ کے زیر نشان اور اردو نے دلی میں سلاطین مغلیہ کے زیر پرچم نشو و نما حاصل کیا پھر شعرا و ادبا نے دونوں کی زمین سخن کو آسمان بنا یا۔ ہندوستان میں ترکی کا رواج نہیں تھوڑے زمانے سے جناب ان شار اللہ خاں صاحب مدیر وطن نے اُردو میں ترکی کے حالات کا اظہار کیا ہے اسکو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمد چہارم کے عہد میں ترکی شعرا نے ایرانی طرز کی تقلید شروع کر دی تھی اور ”نابی“ نے میرزا صائب کی تشبیہات اور نازک خیالیوں کی نقل اُتار کر ترکی لٹریچر میں ایک دلچسپ اور قابل قدر اضافہ کیا تھا پھر سلطان احمد ثالث کے عہد ۱۷۲۳ء میں سب سے زیادہ مشہور ”ندیم“ شاعر گزرا ہے جو ممتاز ترین شعرا میں شمار ہوتا ہے وہ اپنے انداز تحریر کا جو تمام ایرانی اور ترکی شعرا سے جداگانہ قسم کا تھا موجد گزرا ہے۔ اور اب تک کسی کو اس کے نقل و تقلید کی جرأت نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی نے اُسکی تقلید کا حوصلہ کیا تو اسکا کلام اس رتبہ کو نہیں پہنچا۔ جیسے فارسی میں فردوسی

اور اردو میں میرزا غالب کی نظیریں موجود ہیں۔
لیکن اس کے کلام میں میرزا غالب کے کلام جیسا اغلاق نہیں بلکہ وہ میر تقی کے کلام کی طرح سادہ و پرکار ہے اس کا طرز تغزل بے نظیر خوبیوں سے آراستہ ہے۔ غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد بھی لکھے ہیں جو فارسی قصائد کی شان و شکوہ کا اظہار کرتے ہیں اور بایں ہمہ وہ اعلیٰ مطالب کو نہایت سلیس پیرایہ میں ادا کرتا ہے وہ ۱۷۲۳ء میں زندہ تھا مرنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں اس کی تصنیف پر عثمانیہ لٹریچر کا کلاسیکل زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لٹریچر کے فروغ کی ابتدا نفی سے ہوئی اور ندیم کی وفات پر وہ دور ختم ہوا۔ یعنی احمد اول کی تخت نشینی سنہ ۱۶۰۳ء سے لیکر احمد ثالث کے عزل سنہ ۱۷۳۰ء تک رہا۔

پرانی طرز کے شاعروں میں چار شاعر سب سے زیادہ نام آور ہوئے جن کے تخلص فضولی۔ نفی۔ ندیم۔ غالب ہیں۔ شیخ غالب سلطان سلیم ثالث کے عہد سلطنت میں گزرا ہے اس کی کتاب "حسن و عشق" شاعرانہ نازک خیالی میں بے مثل خیال کی جاتی ہے اور یہ چاروں شاعر اپنے اپنے طرز کلام میں جوہر فرد سمجھے جاتے ہیں اور ہر ایک نے شاعری کو اپنے مذاق کے حسب حال ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ غالب استنبولی نے بھی غالب دہلوی کی طرح دوسروں کی تقلید کو پسند نہیں کیا۔
سلطان محمود کے عہد میں ترکی لٹریچر کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ترکی شاعری نے یورپین لٹریچر کی وضع اختیار کی جو بہت جلد وہ ترکی شاعری کا ایک خاص فیشن بن گیا۔

اس دور کے مشہور شاعروں میں واصف اور عزت مولا ہیں اور شاعرات میں فطنت اور لیلی کے کلاموں کو قبولیت خاص حاصل ہے واصف پہلا ترکی شاعر ہے جس نے قسطنطنیہ کی عام بول چال کو شاعری میں داخل کیا۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں اس

دور کی تکمیل کا لگا لگا (جب سے کہ ہندوستان میں اُردو کا پچھلا دور شروع ہوتا ہے) اور ترکی شاعری کی روح نئے قالبوں میں ڈالی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی لٹریچر کا بالکل کایا پلٹ ہوگیا جو دور اول و اوسط سے بالکل نئے قسم کا معلوم ہوتا ہے۔

اس دور کا عام مذاق اس اصول کا پابند ہوگیا ہے کہ شاعری میں صرف آمد کی خوبیاں ظاہر کی جائیں آورد کے تصنع کو بالکل دخل نہ دیا جائے۔ پرانی مسجع اور مقفےٰ عبارتوں اور پیچیدہ اور مغلق ترکیبوں کی جگہ سیدھے سادے الفاظ اور عام بول چال کا خیال رکھا جاتا ہے اچھے لکھنے والوں کو عمدہ عمدہ الفاظ و محاورات کی تلاش کرنا پڑتی ہے لیکن وہ اشعار کی رنگینی کے لئے نہیں ہوتی بلکہ واقعات اور مدعا کو بہترین طریق سے ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ ترکی نظم بھی تقریباً یوروپین طرز کی ہوگئی ہے۔ اکثر پرانے الفاظ بیفائدہ ہونیکی وجہ سے متروک ہوگئے ہیں اور بیشمار الفاظ معانی میں جدید خیالات اور تصورات کو ادا کرنے کی ضرورت کو پورا کرنیکے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ڈرامانویسی کا بھی رواج ہوگیا ہے جو پہلے وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا اور اُردو میں ابتک اس کا چرچا نہیں پرانے طرز کے شیفتہ اور ایرانی تقلید کے فریفتہ ابتک اس طرز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر زمانے کی رفتار کو کون روک سکتا ہے۔ یہ بات ترکی ادبا و شعرا کی خاص ذہانت اور قابلیت کی تھی کہ اُنہوں نے اپنے مذاق میں مغربی لٹریچر کی نقل اتاری جس نے اُن کو ترکی کے پرانے پیچیدہ راستوں سے نکال کر ایک نہایت صاف و ہموار شاہراہ پر لگا دیا ہے۔ اس تغیر اور انقلاب میں زیادہ تر فرنچ زبان کی خوبیوں نے اپنا اثر ظاہر کیا اور پیرس شیراز کا قائم مقام بن گیا لیکن ابھی ترکی لٹریچر اور شاعری میں ایک اور ضروری عنصر شریک ہونے کو باقی تھا اس کی ابتدا سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہ و اقبالہ کے عہد میں ہوئی۔ اور جیسے آپ کے عہد میں علوم و صنائع نے ممالک عثمانیہ میں غیر معمولی ترقی حاصل کی اور تمدن کے ہر شعبہ میں ایک نئی ترقی نمودار ہوئی ویسے

ہی ترکی لٹریچر اور شاعری میں ایک جدید عنصر کا اضافہ ہوا یا یوں کہو کہ غم کی جگہ خوشی نے حاصل کی اور آرزو نے مایوسی کی جگہ دخل پایا اسکی تفصیل یہ ہے کہ اب سے بیس برس پہلے قسطنطنیہ کے ہر گلی کوچہ میں پیرس کے نازک خیال اور لطیف طبع لوگوں کی زبان سنائی دیتی تھی۔ آج اسی طرح دوکان دوکان پر مستعد اور جفاکش اور نازک خیالی کو چھوڑ کر عملی جد و جہد کو مقدم سمجھنے والے بہادروں اور اعلیٰ درجہ کے صناعوں۔ تاجروں سائنٹیفک ماہرین ہر علم و فن میں کمال رکھنے والوں اور بے نظیر سپاہیوں کی قوم (یعنی قوم جرمن) کی زبان بولی اور سنی جاتی ہے۔

سلطان محمود جنت آشیان نے قوم کو اس کی مخالفت کے باوجود پستی و تنزل سے نکلنے اور ترقی کرنیکے وسائل سے آگاہ کیا اور نئی وزارت کی بنیادیں تیار کیں اسکے بیٹے کے عہد میں دور اندیش وزرا نے اس عمارت کو اور بڑھایا اور چونکہ فرانسیسیوں کی زبان اور خیالات موجودہ ضروریات کے جمیع لوازم کو ساتھ لئے ہونے کے علاوہ بہت کچھ ایشیائی مذاق سے مشابہت رکھتے تھے اسکو اپنی قوم کی عام تعلیم کے لئے اس قوم کا شاگرد رشید بنا دیا ہے جس کی دنیا کے ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی دیکھی جاتی ہے۔

فرانسیسی رنگ نمایاں طور پر جن ترکی مصنفوں کی تحریروں میں پہلے پہل دکھائی دیا وہ عاکف اور رشید پاشا ہیں لیکن اصلاح کے اس ابتدائی مرحلہ کو کمال تک پہنچانے کا فخر شناسی آفندی کو حاصل ہوا ہے جو ۱۸۷۱ء میں فوت ہوئے۔ اس میدان میں کمال بک شاعر اکرم بک اور حامد بک نے شناسی کو بینظیر مدد دی۔ فرانسیسی مذاق کے غلبہ کے زمانہ میں ترکی شاعری کا رنگ و انداز اور ٹون کمال رقت انگیز اور اداسی بھرا ہوا تھا اور ترکی شاعر زیادہ تر مرجھائے ہوئے پھول ناکامیوں اور ہجوم افکار کے رنج و صدمات سے گھل گھل کر عنقریب آغوش لحد میں سونیوالی نازنین لڑکیوں اور دوسرے ایسے ہی رقت انگیز مضامین پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے جنکی شیریں مگر حزن آلود نظموں کو پڑھکر

خود بخود یہ خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ ایک بہادر لیکن رحم دل قوم اپنے انجام کو قریب پہنچتا ہوا دیکھکر بعالم بے خبری و محویت بلا کسی قصد کے اس تصور سے اطمینان کر رہی ہے کہ تمام خوبصورت چیزوں کا انجام بھیانک موت ہے ۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ترکی قوم اور اُس کے شعرا کے خیالات اور تصورات کی اب یہ کیفیت نہیں رہ گئی ۔ اب سے بیس سال پہلے پولیٹکل اور تمدنی حالت ہی ایسی مایوسی بخش ہو رہی تھی کہ اگر جدید فرانسیسی شاعری کی زنانہ نازک طبعی اور رقت انگیزی کا اثر بھی نہ ہوتا تو بھی خود بخود قوم اور اُس کے انشا پردازوں پر گردوپیش کے حالات دیکھکر مایوسی کے طاری ہو جانے کے لئے کافی اسباب موجود تھے لیکن اب جرمنوں کے مردانہ لٹریچر کے اثر اور ذاتی استحکام و طاقتوری کے علم سے ترکی لٹریچر اور نظم میں پھر وہی شجاعانہ عزم و استقلال اور مردانہ شگفتگی ۔ فاتحانہ امنگیں حب الوطنی کا جوش اور پیش قدمی و نصرت کی بالیدگی ٹپک رہی ہے جو فاتح شام و مصر و ایران عرب جانبازوں کی رجزوں سے ٹپکا کرتی تھی ۔

ہم نے یہ خیالات تاریخ خاندان عثمانیہ سے اخذ کئے ہیں اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُردو نے ترکی سے زیادہ اپنی نشو و نما کا اظہار کیا ہے ۔ اور جو طاقتیں ترکی کو میسر ہوئیں اور نہیں وہ اُردو کو میسر نہ ہونے پر بھی اردو نے بہت بڑی ترقی ظاہر کی ہے ۔

ترکی ایک محدود رقبہ میں بولی جاتی ہے اور ترکی بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں اُس کے مقابلہ میں اُردو کا قلمرو بہت زیادہ وسیع ہے اور دس کروڑ کی تعداد اردو بولنے والوں کی ہے اسی طرح خدا کے فضل سے ترکی کو سیکڑوں برس سے سلاطین عثمانیہ کے زیر سایہ ترقی کرنے کا موقع ملتا آتا ہے لیکن اردو نے شاہجہاں کے وقت میں سر نکالا اور اُس وقت سے ابتک اُس کو بادشاہی حمایت کا موقع نہیں ملا کیونکہ پہلے فارسی غالب تھی پھر انگریزی کا دور دورہ ہوا تاہم اُس نے خود اپنی نشو و نما کی خود رو طاقتوں سے ایسی ترقی حاصل کی جو بہت کچھ قابل قدر ہے ۔

اور جیسے ترکی کی شاعری اور ادب میں پہلے فرنچ کی روشنی نمایاں ہوئی اور اب جرمن کے برقی لیمپ شاعرانہ دماغ کو روشن کر رہے ہیں ویسے ہی اردو کو انگریزی لیمپوں کی تابناک روشنیوں نے بہت کچھ روشن کر دیا ہے اور انگریزی کے علاوہ ہر قسم کے مغربی خیالات و مقاصد کے اثر سے اردو کی شاعری اور لٹریچر میں مفید تحریکیں کے ساتھ لطافت خیال اور سلاست مقال کو نئے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے اور ہندوستان کے اہل مطابع اور شاعر اور ادیب اور مترجم اردو کے خزانہ ادب میں ہر قسم کے جواہر جمع کرنے میں مصروف ہیں۔

اسی طرح ترکی کے غزل اور قصیدہ کہنے والے شاعروں کے سامنے اُردو کے غزل اور قصیدہ کہنے والے شاعر پیش کئے جا سکتے ہیں جو کسی باب میں اُن سے کم نہیں اور اور انواع بزم و رزم اور رقت انگیزی و رجز نگاری کا مقابلہ میر انیس و میرزا دبیر کے کلام اور مراثی و سلام سے ہو سکتا ہے اور دونوں کے دلنشین اثرات میں اکثر مقامات پر اردو بازی لے جا سکتی ہے۔

ترکی میں مرثیہ لکھنے کا مذاق بہت کم ہے پھر بھی ترکی زبان میں جو مرثیے کسی بڑے نامور شخص کی تعزیت اور یادگار میں لکھے گئے ہیں وہ وہی عربی اور فارسی کے محدود طرز کلام کا نمونہ ہیں جس میں چند شعروں سے زیادہ ترکی نے اپنا زور کلام دکھانے کو کوئی وسیع جادہ پیدا نہیں کیا اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر جو کام کر گئے وہ خود اُن کی معنی آفریں طبیعتوں کا پیدا کیا ہوا وادی ہے جس کی مثال عربی فارسی ترکی کسی زبان میں نہیں ملتی اور ترکی نے کوئی ترقی ایسی نہیں کی جس سے میر انیس اور میرزا دبیر کی شاعری مقابلہ نہ کر سکے۔ یا زور کلام اردو کے دوسرے سخن طرازوں کی تصنیف میں نہ پایا جاوے۔

اربابِ سنت والجماعت پر مرثیہ کا اثر

موسیقی کا عام اثر یہ ہے کہ جب کوئی کثرت سے گانا بجانا سنتا ہے تو وہ کن رسیا ہو جاتا ہے اور اس میں آپ سے تال، سُر، سم۔ لے پہچاننے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور اُس کے اندرونی جذبات گانے کے ساتھ ساتھ اُسکے دل میں ایک باقاعدہ جنبش پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر نظم کو کثرت سے پڑھا اور سُنا جائے تو طبیعت میں ایک خاص موزونی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آپ شاہنامہ پڑھنے کی عادت ڈالیں تو بعد چندے آپ کی طبیعت میں ایک خاص روانی پیدا ہو جائے گی جو اس سے پہلے نہ تھی ایسے ہی کثرت سے مرثیوں کا پڑھنا اور سُننا اندرونی جذبات کو ابھارتا اور طبیعت کو موزوں بننے کی رہبری کرتا ہے اور لطافتِ کلام کی خوبیاں اُس موزونیت کے ساتھ ساتھ اس میں نقادی کی قابلیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اور حُسنِ کلام کے جلوے اُس کے مذاق میں ادراک کی قوت کو بڑھا دیتے ہیں۔

میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے وہ عجیب اثر ظاہر کیا ہے جو امام علیہ السلام کے واقعہ شہادت سے زیادہ عام دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس پچاس ساٹھ برس میں لاکھوں آدمیوں نے بلا قید مذہب اُنکے کلام سے دلچسپی ظاہر کی اور پورے شوق سے اُن کی مجلسوں میں شریک ہوئے ہیں راقم نے لکھنؤ الٰہ آباد عظیم آباد۔ حیدرآباد میں ہزاروں سنیوں کو اُن کی مجالس میں شریک دیکھا جس میں بڑے بڑے صاحب علم و ادب لوگ تھے اور سُنّی تو سُنّی ہزاروں ہندوؤں کو اُنکا گرویدہ پایا۔ اور آج تک وہ سلسلہ قایم ہے۔ یعنی ہزاروں آدمی بجائے حصولِ ثواب کے اُنکے کلام یا اُنکے باقیات الصالحات کے اندازِ بیان کے سُننے کو جمع ہوتے ہیں اور مرثیوں کے رنگ نے وہ عام دلچسپی اور دلنشینی حاصل کی ہے کہ ہر مذہب کے لوگ

اپنے پیشواؤں کے اوصاف اور انکی شجاعت اور شہادت کے کارناموں اور اُن کے مصائب کے اظہار کو مرثیوں کا رنگ کاٹنے لگے ہیں - اور زمانہ حال کی نظمیں بھی مرثیت کے رنگ میں رنگی جانے لگی ہیں - چنانچہ جناب مولوی فاروقی صاحب نے جو مولانا شبلی نعمانی کے اُستاد ہیں اور فلسفہ و ادب کے زبردست ماہر مانے جاتے ہیں اعلیٰ حضرت سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہٗ فرمانروائے ترکی کی فتح یونان کی ادائے تہنیت اور بہادر ترکوں کے اظہار شجاعت کو مرثیہ ہی کا رنگ قبول کیا ہے - اور مولوی محبّ حسین صاحب مترجم انگریزی ملازم سرکار نظام حیدرآباد نے حضرت خلیفہ دوم کی شہادت کا واقعہ اور اُن کے دوسرے اوصاف کے بیان کرنے کو مرثیہ ہی کی شان پسند کی ہے - میں ان دونوں تصنیفوں کے ابتدائی بند نقل کرونگا جس سے معلوم ہو کہ مرثیت کی شان نے ارباب سنت والجماعت کے شاعرانہ مذاق پر کیسا اثر ڈالا ہے -

لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرات خلفاء کے واقعات رحلت ایسے پُر اثر نہیں جیسے امام حسین علیہ السلام کے واقعات ہیں اس لیے کہ انہیں تمدن اور فتوح کی کامیڈی ٹریجیڈی کا اثر ظاہر ہونے نہیں دیتی اور اہل بیت رسالت کے تمام واقعات درد و مصائب میں ڈوبے ہوئے ہیں جن کے نظم کرنے کے ساتھ ٹریجیڈی کا اثر شریک ہوتا ہے اور وہ اثر تمام اثروں پر غالب آجاتا ہے -

مسدس فتح یونان کا مطلع[لہ]

تصنیف علامۃ الادب مولوی محمد فاروقی صاحب چریا کوٹی

سب ادیبوں میں سے شمع ہدیٰ دینِ محمد	اور راہبر راہِ خدا دینِ محمد
آفاق میں سے نخل ہما دینِ محمد	اور مامن ہر شاہ و گدا دینِ محمد

لہ یہ مسدس پیسہ اخبار ۴ جولائی سنہ ۱۹۰۱ء میں چھاپا گیا ہے ۱۲

کیا ڈر ہے اُسے جس پہ ہوا اسلام کا سایہ
یہ دین ہے اللہ کے انعام کا سایہ

مطلع مسدس[1]

تصنیف مولوی محب حسین صاحب ملازم سرکار نظام حیدرآباد

ہے ذوالفقارِ حیدرِ صفدر قلم مرا
منشی چرخ دیکھے تو جاہ و حشم مرا
برپا ہے کارزارِ سخن میں علم مرا
بھرتا ہی ہر فصیح فصاحت میں دم مرا
مداحی عمرؓ کا مجھے افتخار ہے
برتر فلک سے بھی مرا عز و وقار ہے

ان کے علاوہ اس زمانہ کے علامۃ الادب مولانا شبلی نعمانی نے ایک مستقل کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" میں اپنی دلچسپی کا قابل قدر ثبوت دیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ میر انیس کی مرثیہ گوئی نے دل پر کیسا گہرا اثر ڈالا ہے جس نے ان سے ایسی مستقل کتاب لکھوا ڈالی۔

ہندوؤں پر مرثیہ کا اثر

بادشاہی زمانے میں لکھنؤ دلی کے بعد دوسرا شہر تھا جس نے اپنی تراش خراش اور ہر قسم کی نفاست اور لطافت میں اپنے آپ کو روشناس آفاق کر رکھا تھا اور چونکہ وہاں کے حکمرانوں کا مذہب شیعہ تھا اس لئے تعزیہ داری و مرثیہ خوانی کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی اور دربار شاہی کے حسن اخلاق اور طرز معاشرت نے ہر فرقہ اور ہر مذہب میں اپنا اثر

---

[1] یہ مرثیہ رسالہ دبدبۂ آصفی نمبر ۱۲ جلد ۹ میں طبع ہوا ہے ۱۲

پیدا کیا جو پچاس برس کے قریب زمانہ گزرنے پر آج تک نظر آرہا ہے یعنی لکھنؤ کے ہزاروں ہندو تعزیہ بناتے مجلسیں کرتے اور مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے اُنکے قلوب پر ایسا گہرا اثر کیا ہے کہ وہ اُس مذاق سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض خوش طبع ہندؤں نے مرثئے کی وضع میں نظمیں لکھنا شروع کردی ہیں چنانچہ لکھنؤ سے ایک نظم الاخبار جاری ہوا تھا جو بالکل نظم میں لکھا جاتا تھا۔

وہ کئی برس جاری رہا اُسکے ناظموں میں تمنا وافق نے زیادہ نظمیں لکھیں وہ اکثر مرثیوں کے طرز کی تھیں۔ اور اب بھی یہ دونوں صاحب جو ہندو پارٹی کے لیڈر ہیں اپنے مذہبی اور قومی خیالات اسی رنگ میں ادا کرتے رہتے ہیں۔ اُن نظموں کو مسلمان بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اُن کے علاوہ میں نے کانپور کے ماہواری رسالہ زمانہ میں جو اُردو کی نظم و نثر کا قابل قدر مخزن ہے۔ برج نراین صاحب چکبست لکھنوی کی ایک نظم دیکھی جس میں رامائن کا ایک سین دکھایا گیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی قابل قدر صحبتوں نے عام دماغوں پر کیسا عجیب اثر کیا ہے۔ دخل کیا جو اُردو کے حسن کلام کے سوائے ہندوانہ قسم کے الفاظ جیسے ماتا وغیرہ کو داخل نظم کیا گیا ہو۔ یہ نظم مسدس کے طور پر لکھی گئی ہے اور میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کا رنگ بھرا ہے اس میں ہندوستان کے مشہور مقدس شہزادہ رامچندر کا وہ وقت دکھایا ہے جبکہ وہ ایک زمانہ دراز کے لئے جنگل کی بود و باش اختیار کرنے پر راضی ہوتے ہیں اور اُن کی مادر گرامی اُن کو سمجھاتی ہیں کہ ایسا نہ کرو۔ یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوگا لیکن سعادتمند شہزادہ اپنے محترم باپ کی بات کو پورا کرنے پر آمادہ ہے۔

میں اُن بندوں کو بجنسہ نقل کرتا ہوں۔ نقادان سخن دیکھیں کہ ان میں مرثیت کا کتنا گہرا رنگ ہے اور لکھنؤ کے ہندو سخن طراز نے اُسکو کس خوبی سے لکھا اور ادا کلام میں

فصاحت اُردو کا کیسا خیال رکھا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی سے اُس کو کیسی قریبی مشابہت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگواروں کے طرزِ بیان نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں پر کیسا اثر ڈالا ہے جو دوسری نوعیت سے حسنِ کلام بن کر دوسرے مذاق میں جلوہ گر ہوا ہے اور وہاں بھی اُس نے مذہبی خدمت کے سوائے دوسری خدمت پسند نہیں کی۔

یہاں تک باغ سینچا باغباں نے خونِ بلبل سے ۔۔۔ کہ آخر رنگ ہو کر پھوٹ نکلا عارضِ گل سے

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام ۔۔۔ راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام ۔۔۔ دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

آخر ہے کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اُداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال ۔۔۔ خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال ۔۔۔ سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ ۔۔۔ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ ۔۔۔ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھونے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا ۔۔۔ افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا

اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخمِ ستم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
لیکن ہیں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید

لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں میں گزارے ہیں ماہ و سال
لائے دلہن جو بیاہ کر شادی ہوئی کمال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال

چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ — منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ — اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز — اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز — لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور — مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور — لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر — ہونا جو ہے سب اُس کے بہانے ہیں سر بسر
اسبابِ ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر — کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار — واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار — ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں

دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سپہر بگڑ زمانے سے انقلاب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے خراب
جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ مُنہ ہی دیکھتے تھے جنکا ہر گھڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑکر نہیں پڑی
قایم تھیں جنکے دم سے امیدیں بڑی بڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کتنے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ہو کبریا کی شان اگر رستے ہی ماہ و سال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جب غریب پہ رنج و محن کا بار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار
کرتا ہے اُس کو صبر عطا آپ کردگار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ کبھی نہیں رنج کا مقام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
قایم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں

ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بےشمار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار

موقوف کچھ ریاض پہ انکی نہیں بہار
وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر

صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
رہتا نہیں وہ حال سے بندوں کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

برج نرائن چکبست لکھنوی

رباعی

اصنافِ سخن میں رباعی، نہایت پُرلطف و بکار آمد چیز ہے یہ ایسا سانچہ ہے جس میں فلسفہ، حکمت و اخلاق، نصائح و معرفت کے بڑے بڑے اصول چار مصرعوں میں سما جاتے ہیں کوئی رباعی روزمرہ اور محاورہ کے انمول موتی اپنے دامن میں بھرے ہوتی ہے جو فنِ ادب کا قیمتی جوہر ہوتے ہیں۔ رباعی کی ایجاد کا فخر عرب کو حاصل ہے اس کے بعد فارسی میں اس کی تقلید کی گئی اور فارسی رباعیوں میں بڑے بڑے معنی خیز مطالب اور فلسفہ و حکمت کے مسائل بیان کئے گئے ازآنجملہ عمر خیام کی رباعیاں مشہور

آفاق ہیں۔ یورپ میں بھی اُن کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے بلکہ انگلستان میں ایک خاص کلب عمر خیام کے نام سے قایم ہے جہاں تاریخ مقررہ پر علم و فن کے بڑے بڑے نقاد جمع ہوتے ہیں۔ پھر اُردو میں اُس کی نقل کی گئی۔ ہر چند اردو کے سخن طرازوں نے تصنیف رباعیات پر زیادہ توجہ نہیں کی جس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص اُسکے اوزان اور ضبط کلام پر قادر بھی نہیں ہو سکتا اسی لیے یہ حصہ زیادہ تر میر انیس اور میرزا دبیر جیسے معنی آفرینوں کے حصہ میں آیا اور انہوں نے رباعیوں میں بھی ایک نئی روح پھونک دی اور اُردو کے قالب میں نئی جان ڈالدی۔

منشی رحمت اللہ صاحب رعد کانپوری نے جنکا مطبع حسن و لطافت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور مولانا روم کی مثنوی اور حافظ شیراز کے دیوان کو انہوں نے بے انتہا خوشنمائی کے ساتھ چھاپا ہے اُسی طرح میر انیس مغفور کی رباعیاں جمع کرکے زیور طبع سے آراستہ کی ہیں میں ذیل میں میر انیس کی چند رباعیاں نقل کرتا ہوں جو اُردو کا سرمایۂ ناز اور حسن مقابل کا خلاصۂ امتیاز ہیں۔

رباعیات میر انیس مغفور

معرفت الٰہی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
نزدیک رگ جاں سے ہو اُس پہ یہ بُعد
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

نعت

دنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں
باریک ہے ذکر قرب معراج رسولؐ
کس راز سے یہ خلق کے آگاہ نہیں
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

خیالِ آخرت

اب خواب سے چونک وقتِ بیداری ہے — لے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک — یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

روح و تن کا فراق

جس دن کہ فراق روح و تن میں ہوگا — مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رخت تو پہن کر غافل — اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

قبر

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — رخ سب سے پھیر کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

لوازمِ درجات

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے — جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہلِ سخن تیز زباں — تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

حاسد

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے — کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے سخن کی تاثیر انیس — رو دیتے ہیں مثلِ شمع جلنے والے

دنیا کی حالت

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے — مانندِ حباب ہستیِ انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد — سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

زندگی

جو شے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے — جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے جسم جہاں میں عمر مانندِ حباب — غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

تلازمۂ شراب

ایک ایک قدم لغزش مستانہ ہے
گلزار بہشت اپنا میخانہ ہے
سرمست ہیں جب ساقی کوثر سے
آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہے

قبر کی تنہائی

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے
آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نے دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

بڑھاپا

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے
ہنگام بیخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلیے اب چوب دار مرگ آیا ہے

خاک لحد

کانوں میں صدا حرف پریشانی ہے
دیکھا جدھر آنکھ اٹھا کے ویرانی ہے
مشہور علاج درد سر ہے صندل
یاں خاک لحد صندل پیشانی ہے

قدرت باری

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہے
ہر پھول سے صنعت صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیط زخار[1]
ہر ایک نفس سے جزر و مد[2] پیدا ہے

حالت زمانہ

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخ کہن نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کہانتک نکل چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

سخن جان ہے

انسان ذی عقل و ہوش ہو جاتا ہے
اور صاحب چشم و گوش ہو جاتا ہے
گر جان نہیں سخن تو بتلایئے پھر
کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

[1] محیط زخار دریائے اعظم ۱۲ [2] جزر و مد جوار بھاٹا ۱۲

اوجِ منزلت

بالیدہ ہوں وہ اوج سے مجھے آج ملا
ظلِ علمِ صاحبِ معراج ملا
ممبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم
اب چاہیے کیا تخت ملا تاج ملا

انجامِ دنیا

غافل تجھے کیوں خواہشِ دنیائے دنی ہے
پیوندِ زمیں ہر کوئی درویش و غنی ہے
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہِ خاک گلے میں کفنی ہے

معرفت

گلشن میں پھروں کہ سیرِ دریا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

رحمتِ باری

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

دیگر

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری
خلق و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے
دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

حالتِ زندگی

گو صورتِ دریا ہمہ تن جوش ہوں میں
لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش ہوں میں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا
مانندِ حباب خانہ بردوش ہوں میں

خودداری

عزت رہے یار و آشنا کے آگے
مجبور نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں انیس
یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

خود ستائی

کیوں زر کی ہوس میں آبرو دیتا ہے
ناداں یہ کیسے فریب تو دیتا ہے
لازم نہیں اپنے منہ سے تعریف انیس
خالص جو ہے مشک آپ بو دیتا ہے

فروتنی

رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

زندگانی

دو دن کی حیات پر عبث غرہ ہے
خورشید نہ بن خاک کا تو ذرہ ہے
ہر وقت نہال زندگانی کے لئے
یہ آمد و شد نفس کی گویا آرہ ہے

آرام قبر

فردوس ہر اک قبر کا کونا ہوگا
مخمل نہیں خاک کا بچھونا ہوگا
راحت دنیا میں غیر ممکن ہے انیس
آرام سے واں لحد میں سونا ہوگا

نرمی

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے
جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہیں
دندان صف بستہ ہیں زباں کے آگے

دزدان مضامین

کب دزد سے دولت ہنر بچتی ہے
لے بھاگتے ہیں جب نظر بچتی ہے
ممکن نہیں دزدان مضامیں سے نجات
سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

شیریں کلامی

نے ہجو کا دعویٰ ہے نہ خود بینی ہے
باتوں میں اثر زباں میں رنگینی ہے
شیریں ہیں سخن نمک علاوہ دیکھو
ہے طرفہ مزا نمک میں شیرینی ہے

مشک آنست کہ خود ببوید

کس مُنہ سے کہوں لائق تحسین ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر
کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں

بیناے سخن

مضمون گو ہر ہیں اور صدف سینہ ہے
آئینہ سے روشن ہے کمال اپنا انیسؔ
ہے صاف تو یہ کہ قلب آئینہ ہے
ہم اُس کو نظر آئیں گے جو بینا ہے

معرفت

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

انسان

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
ادنیٰ کے لئے مقام اعلا بخشا
اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

دولت فقر

یہ اوج یہ مرتبہ ہما کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر
یہ دلق مرقع امرا کو نہ ملے
برسوں ڈھونڈے تو بادشاہ کو نہ ملے

خیال عاقبت

دل بُت سے اُٹھا کے حق پرستی کیجے
آخر اک دن یہ پاؤں ہوں گے بیکار
بے تیغ انیسؔ قطع ہستی کیجے
بہتر ہے یہی کہ پیشِ دستی کیجے

خاکساری

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

توشۂ آخرت

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

رودادِ قبر

راحت میں بسر ہوئی کہ ایذا گزری
کیوں کر تاریک گھر میں تنہا گزری
اے کنجِ لحد کے سونے والو افسوس
کس سے پوچھیں کہ تم پہ کیا کیا گزری

بندِ اجل

کچھ عقل کی میزان میں تولا نہ گیا
چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس
یہ بندِ اجل کسی سے کھولا نہ گیا

دنیا میں آنا

کیا سوچ کے اس دارِ فنا میں آئے
آفت میں پھنسے دامِ بلا میں آئے
اس طرح عدم سے آئے دنیا میں انیس
جیسے کوئی کاروانسرا میں آئے

سامانِ حسرت

وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ
جو اوج پہ تھے زیرِ زمیں آج ہیں وہ
قرآن لکھا کے وقف جو کرتے تھے
اک سورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ

اعمالِ حسنہ

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

وقتِ مرگ

اے زیرِ قدم لحد کا باب آ پہنچا
ہشیار ہو جلد وقتِ خواب آ پہنچا
پیری کی کٹی دوپہر ڈھلی آہ انیس
ہنگامِ غروبِ آفتاب آ پہنچا

جوانی و پیری

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائیگی
مرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی
روتے ہو انیس کیا جوانی کے لئے
پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

قافلہ ہستی

آلودہ عیش اس غم جانکاہ میں ہے
زندہ ہے وہ دل جو یاد اللہ میں ہے
اپنی واماندگی سے گھبرا نہ انیس
پہنچا کوئی منزل پہ کوئی راہ میں ہے

بے لطف زندگی

کیا حال کہیں دل کی پریشانی کا
کھانے کی نہ لذت نہ مزا پانی کا
مر رہیئے کسی دشت کے دامن میں انیس
پردہ ہے یہی جامۂ عریانی کا

دام دنیا

دنیا کو نہ جانو کہ دل آرام ہے یہ
اے پختہ مزاجو طمع خام ہے یہ
ہاں سوچ کے پانوں اس زمیں پر رکھو
چھٹتا نہیں جب پا پھنس گئے وہ دام ہے یہ

ہوسناکی

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے
جاتا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پانوں تو سر پھرتا ہے

اپنی نسبت

کس دن فرس خامہ تگ و دو میں نہیں
مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں
ہر چند کہ ہوں خسرو اقلیم سخن
پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں

چاہ دنیا

راحت کا مزا عدوئے جانی نکلا
دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا
پیاسے رہے آکے چاہِ دنیا پہ انیس
نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

معرفت

سایہ سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اُس کا عاشق ہوں انیس
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

قدرِ اشک

مجلس میں عجب بہار چشم تر ہے
ہر لخت جگر رشک گل احمر ہے
اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی
بیقدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے

غزل گوئی

عربی اور فارسی میں شاعری کا بہت بڑا حصہ تغزل سے بھرا ہوا ہے فارسی میں سیکڑوں دیوان غزلیات کا مجموعہ ہیں۔ اور اُردو نے بھی غزلیات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ غزل میں ایک مطلع ہوتا ہے اور باقی تمام اشعار اُسی ردیف و قافیہ یا صرف قافیہ کی پابندی سے کہے جاتے ہیں اور کم سے کم پانچ اور بدرجۂ اوسط پندرہ بیس شعر کی غزل ہوتی ہے اور ہر شعر کا مطلب جدا ہوتا اور اُسی شعر پر تمام ہو جاتا ہے بعض اشعار قطعہ بند بھی آپڑتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میر انیس کی شاعری میں غزلیات کا پتہ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اُنکے سیکڑوں سلاموں سے غزلیات کا مجموعہ فراہم ہو سکتا ہے چنانچہ میں چند سلاموں سے اُنکے اشعار منتخب کر کے یہ گلدستہ آپکی نذر کرتا ہوں۔

غزلیات از کلام میر انیس

ہماری آنکھ میں آنسو ہیں یا دریا چھلکتا ہے
جگر میں داغ ہیں یا کھیت لالے کا لہکتا ہے
رقمِ تحریرِ گلریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریرِ کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

انیس اللہ تجھ پر سہل کر دے قبر کی منزل
لحد کا دھیان جب آتا ہے کیا کیا دل دھڑکتا ہے

دیگر

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

ہر اک کے ساتھ ہے روشن داو طلوع و غروب
سحر کو چاند نہ تھا شب کو آفتاب نہ تھا

انیس عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوتراب نہ تھا

دیگر

کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

قناعت و گہر آبرو دولت دیں
ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت کے
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

مسافر شب اول بہت ہے تیرہ و تار
چراغ قبر ابھی سے جلا نہیں رکھتے

وہ لوگ کون سے ہیں اے خدائے کون و مکاں
سخن کو کان سے جو آشنا نہیں رکھتے

انیس بیچ کے جاں اپنی ہند سے نکلو
جو توشۂ سفر کربلا نہیں رکھتے

دیگر

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اڑ گیا جب رنگ رخ سے استخواں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

جو عدم سے آگیا دنیا میں بولی ہنس کے موت
اور لو دو چار دن کے مہماں پیدا ہوئے

ضبط دیکھو سب کی سن لی پر نہ کچھ اپنی کہی
اس زباں دانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوئے

یک بیک ایسا زمانہ میں ہوا ہے انقلاب
قدرداں سب اٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

احتیاطِ جسم کب انجام کو سوچا انیس
خاک ہونے کو یہ مشتِ استخواں پیدا ہوئے

دیگر

جز پنجتن کسی کی تولا نہ چاہیے
غیر از خدا کسی کا بھروسا نہ چاہیے

اک در پہ بیٹھ گر ہے توکل کریم پر
اللہ کے فقیر کو پھیرا نہ چاہیے

راحت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر کب
ایذا ابھی چار دن ہو تو شکوا نہ چاہیے

ہر کوہ پر نہ ہوگی تجلی مثالِ طور
ہر ہاتھ کے لئے یدِ بیضا نہ چاہیے

کھانے کو رزق رہنے کو گھر اور لحد کو جا
دنیا میں ایسا جان کو کیا کیا نہ چاہیے

مرقد چراغِ داغ سے روشن رہا انیس
شب کو اکیلے گھر میں اندھیرا نہ چاہیے

دیگر

زرد ہے چہرہ نحیف و زار ہوں
اے مسیحائے زماں بیمار ہوں

مثلِ بوئے گل سفر ہوگا مرا
وہ نہیں ہیں جو کسی پہ بار ہوں

لب بلب ہیں دم بھر جدا ہوتی نہیں
کس گلِ تر کے گلے کا ہار ہوں

عالمِ پیری میں آئے کون پاس
بے عصا گرتی ہوئی دیوار ہوں

ہر کس و ناکس سے جھکنے کا نہیں
ہم وہ ہیں تیغ جو ہر دار ہوں

سوکھ کر کانٹا ہوا ہوں اے انیس
آنکھ میں دشمن کی اب تک خار ہوں

دیگر

کچھ اور جز سخن نہیں اہلِ سخن کے پاس
مجرائی کیا زباں کے سوا ہے دہن کے پاس

دیگر

ضبطِ گریہ ماتمِ سرور میں ہو سکتا نہیں
سر جھکا کر بیٹھ محفل میں جو رو سکتا نہیں

رات اندھیری پرسشِ اعمال ایذائے فشار — قبر میں بھی چین سے انسان سو سکتا نہیں
کارزاتی ہیں ہیں عاجز کارسازانِ جہاں — گرد اپنے منہ کے پانی آپ دھو سکتا نہیں
نظم سے ہے یہ یادرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ — جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

دیگر

قرار از دل آشکارا نہیں — وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں
وہ گُل ہوں جدا جسکا ہے سب سے رنگ — وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں
وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور — وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں
بہت زالِ دنیا نے دیں بازیاں — میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں
فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا — امیروں کا یاں تک گزارا نہیں
جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا — جو آتش پہ ٹھیرے وہ پارا نہیں
بچھڑے دوست جب ہوگئی قبر بند — کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں
کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ — عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

دیگر

واقف خمارِ غم سے نہیں دل فقیر کا — پیمانہ کش ہوں بادۂ خمِ غدیر کا
اثنا عشر کے گھر کا گدا ہوں پتا یہ ہے — بارہ دری میں رہتا ہے بستر فقیر کا
اے باغباں میں بلبلِ گلزارِ قدس ہوں — سدرہ پہ آشیاں ہے مرے ہمصفیر کا
پوچھے کوئی پتہ تو یہ کہہ دیجیو انیسؔ — ہے وادی السلام میں بستر فقیر کا

دیگر

خیالِ چہرۂ شہ وقتِ خواب رہتا ہے — تمام شب مرے گھر آفتاب رہتا ہے
بشر کی ریش میں جبتک خضاب رہتا ہے — اگر رہا تو بس اتنا شباب رہتا ہے
ہمارے شیشۂ دل کو نہ توڑیو ہرگز — یہ ظرف وہ ہے کہ جس میں گلاب رہتا ہے

جو دل جلے ہیں انہیں کا سخن ہو گرما گرم
مزا ہے سیخ پہ جب تک کباب رہتا ہے

لگا کے آتش قلب و جگر کو اشک نکل
دوآتشہ ہو تو برسوں گلاب رہتا ہے

بھری ہو کونسی یارب دلِ انیس میں آگ
کہ جسکی آگ سے دوزخ کباب رہتا ہے

دیگر

ساتھ جاتا نہیں کچھ جز عملِ نیک انیس
اس پہ انسان کو ہے خواہشِ دنیا کیا کیا

دیگر

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

نوا سنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

دیگر

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعف پیری سے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یہ غل تھا مہر نبوت پہ جب چڑھے حسنینؑ
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

مزا یہ طرفہ ہے مضمون دستیاب نہیں
مقابلہ پہ چڑھائے ہیں آستینوں کو

غلط یہ لفظ وہ بندش بری یہ مضموں سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

دہانِ کیسہ زر بند کر یہ اے منعم
خدا کے واسطے وا کر جبیں کی چینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیئے ہردم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

دیگر

خدا کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا — اُسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا
قریب قبر ہم آئے کہاں کہاں پھر کر — تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا
کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس — عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دیگر

ہوا جو عشق ثنائے ابوتراب مجھے — خدا نے کر دیا ذرے سے آفتاب مجھے
خزانہ گہر بے بہا تھا پر دوں میں — دکھائے چشم نے کیا کیا درِ خوش آب مجھے
کبھی نہ دوں عرق روئے شاہ سے نسبت — ہزار طرح سے چھینٹے جو دے گلاب مجھے
چھلکتے جام رہیں میکدہ رہے آباد — خم غدیر کی دے ساقیا شراب مجھے

دیگر

نمود بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں — وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
ارے نہ آئیو دنیائے دوں کے دھوکے میں — سراب ہے یہ جسے موج آب سمجھے ہیں
شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیروں کو — سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو — اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

دیگر

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے — شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے
کنج عزلت میں مثالِ آسیا ہوں گوشہ گیر — رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے
قطع امید ایک در سے گر ہوئی کچھ غم نہیں — اور کچھ سامان کردیگا خدا میرے لئے
ہر نفس آئینہ دل سے یہ آتی ہے صدا — خاک تو ہو جا تو حاصل ہو جلا میرے لئے
اے ہوس اپنی اپنی قسمت اسکا رشک کیا — کیمیا تیرے لئے خاک شفا میرے لئے

خاک سے ہو خاک کو الفت تڑپتا ہوں انیسؔ	کربلا کے واسطے میں کربلا میرے لئے

دیگر

رنج دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں	جز غم آلِ عبا ہم اور غم رکھتے نہیں
در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے	سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں
دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھرینگے انکے سر	آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں
جو سخی ہیں مالِ دنیا سے ہیں خالی انکے ہاتھ	اہلِ دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے نہیں
زور سے اسکے لیا ہے ہم نے میدانِ سخن	اور نیزہ ہاتھ میں غیر از قلم رکھتے نہیں
یہ دوات و خامہ ہے ملکِ فصاحت کا نشاں	کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

قصیدہ

قصیدہ غزل کی طرح مطلع کے ردیف و قافیہ یا صرف قافیہ کی پابندی سے لکھا جاتا ہے اور قصیدہ میں شعر زیادہ ہوتے ہیں اور ایک سلسلہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قصیدہ کا درجہ غزل سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ غزل کا مقصد معشوق سے بات کرنا اور قصیدہ کا موضوع بادشاہ اور ممدوح سے غرض کلام ہوتا ہے اسی لئے دونوں کے اقسام ادب میں فرق ہونا لازمی ہے اور ہر مقام کے مناسب حال الفاظ اور حسن مقال کی خوبیوں کو دکھانا ہی ایک زباندان شاعر کا کمال ہے ہر کوہ نتابد ایں صدا را

قصیدہ میں تشبیب، گریز، مدح ممدوح یہ تین خاص طور سے دیکھے جاتے ہیں تشبیب میں لالہ و گل و ریحان و سنبل، جام و سبو ساقی و مطرب اور دوسرے حسنِ شباب کے لوازم کا بیان ہوتا ہے پھر ان سے گریز کرکے مدح پر توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یہ مقام ایسا ہونا چاہئے جو تشبیب کے بعد سامعین کو شوق سے

مدح کے سننے پر آمادہ کر دے۔ زاں بعد مدح اُن لفظوں میں ہونا چاہیے جو اس درجہ کے لائق ہیں۔ اور اُن چیزوں کی مدح کرنا چاہیے جو ممدوح کے ساتھ خاص نسبت رکھتی ہیں۔ سو یہ تینوں باتیں میر انیس کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میر انیس نے اپنے اکثر مرثیوں کے چہرے جس آب و تاب سے آراستہ کئے ہیں اُن میں تمام لوازم تشبیب کو دیکھ لیجئے جو اس بہتات سے کسی دیوان میں دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ اور تشبیب کے بعد جس خوبصورتی سے اُنھوں نے مقام گریز کو ادا کیا ہے وہ بجائے خود دیکھنے کی چیز ہے۔ پھر ائمہ علیہم السلام کو دین و دنیا کا بادشاہ سمجھ کر جس شان و شکوہ سے مدح سرائی کی اور جو الفاظ ہر مقام کے مناسب درجہ و ادب صرف کئے وہ ایسے ہی درجہ شناس زبان آور کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ قصیدہ لکھنے والوں کو چاہیے کہ اُن مقامات کے الفاظ اور اُن کی طرز ادا کو دیکھیں۔ سمجھیں اور اپنے قصائد میں اُن کا خیال رکھیں۔ اور مسدس کی جگہ قطعہ و قصیدہ کے لباس میں پیش کریں۔ میر صاحب کے کلام سے ایسے سیکڑوں مقام انتخاب ہو سکتے ہیں۔ میں اس مختصر میں کیا کیا لکھ سکتا ہوں۔

مثنوی

مثنوی کے ہر شعر کا ردیف و قافیہ جدا ہوتا ہے۔ البتہ ایک شعر سے دوسرے شعر کا سلسلہ قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اور اصنافِ سخن میں مثنوی ایک بڑی بکار آمد چیز ثابت ہوئی ہے۔ اکثر شعرا نے مختلف مذاق میں مثنویاں لکھی ہیں۔ تصوف میں مولانا روم کی مثنوی مشہورِ آفاق ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ اور نظامی کا سکندر نامہ بھی مثنوی کی طرز پہ لکھے گئے ہیں اور اکثر رزم و بزم اور حسن و عشق کے واقعات اور افسانے مثنوی

کے رنگ میں ادا کئے گئے ہیں۔ اردو میں میر حسن کی مثنوی اور گلزار نسیم کو قبولیت عام اور شہرت تام حاصل ہے۔ آپ کہیں گے کہ میر انیس نے کوئی مثنوی نہیں لکھی لیکن میرے نزدیک یہ خیال ٹھیک نہ ہوگا۔ میرے نزدیک میر انیس کے ہزاروں مرثیوں سے سینکڑوں مثنویاں بن سکتی ہیں اور اگر آپ ایک بڑی مثنوی بنانا چاہیں تو اُن کے مرثیوں کو جمع کر کے اُن میں سے ایک بحر کے سب مرثئیے نکال لیجئے پھر اُن مرثیوں کے ہر واقعہ کو مورخانہ طور پر ترتیب دیجئے جس سے ایک کے بعد دوسرے واقعہ کی داستان چسپاں ہوتی ہو پھر مسدس کے ہم قافیہ دو شعروں میں سے ایک شعر نکال دیجئے اور بعض مقامات پر اُس کو دوسری جگہ چسپاں کیجئے اس طور سے آپ ایک بڑی مثنوی متعدد واقعات کی بنا سکتے ہیں میں اس مقام پر میر انیس کے ایک مرثیہ سے ایک مثنوی بنا کر بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ انصاف سے دیکھیئے کہ میر صاحب کے کلام نے مسدس سے نکلکر مثنوی کے رنگ میں کیا حُسن ظاہر کیا ہے۔

جنگ نامہ میر انیس

حضرت قاسمؑ گلگوں قبا کی جنگ

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح	سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گذار صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا	کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا
چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم	وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا	تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
وہ صبح نور اور وہ سبزہ وہ لالہ زار	کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے	ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں

ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

اوجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی
کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سرخ و سبز و زرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر ٹپکتی تھیں موجیں فرات کی

تھا لشکرِ یزید میں سامانِ قتلِ شاہ
ہر سو جما رہا تھا صفیں شمرِ روسیاہ

اک صف میں برچھیوں کی چمک تھی کہ الحذر
انیاں وہ توڑ ڈالیں جو فولاد کا جگر

جب بندھ چکیں صفیں تو علم کھل گئے تمام
غل پڑ گیا کہ جنگ کو نکلیں شہِ انام

سن کر یہ غل محل سے برآمد ہوئے حضور
پڑھنے لگے درود رفیقانِ ذی شعور

حق کے ولی مصاحبِ سردارِ انس و جن
کوئی جوان کوئی متوسط کوئی مسن

وہ گورے گورے جسم قبائیں وہ تنگ تنگ
زیور کی طرح جسم پہ زیبا سلاحِ جنگ

کہتے تھے سب چڑھائے ہوئے آستین کو
آقا کبھی کہیں تو الٹ دیں زمین کو

تھے اک طرف عزیزِ شہِ آسماں وقار
جانباز سر فروش بہادر وفا شعار

غازی تھے صف شکن تھے جری تھے دلیر تھے
جس میں علیؓ رہے اُسی بیشہ کے شیر تھے

لشکر سے تب بڑھا پسرِ سعد چند گام
چلے میں رکھ کے تیر یہ سب سے کیا کلام

ہے شان مجکو خلق میں جینا حسینؑ کا
کیا شاد ہوں ہدف ہو جو سینہ حسینؑ کا

لکھا ہے جب لگا کے وہ ناوک ہٹا شریر
یکبار فوجِ شہ پہ چلے دس ہزار تیر

جس وقت خاتمہ رفقا کا ہوا بخیر
تھے پھر تو سب عزیز نہ تھا اُن میں کوئی غیر

رخصت ہوا حسینؑ سے پھر دلبرِ حسنؑ
برہم ہوئی وہ بزم وہ صحبت وہ انجمن

دولہا کے نورِ رخ کی ضیا چرخ تک گئی
جولاں کیا فرس کو تو بجلی چمک گئی

پہنچا جو رزم گاہ میں وہ غیرت قمر / نیزہ پکڑ کے گھوڑے کو پھیرا ادھر ادھر
اللہ ری چمک رخ پر آب و تاب کی / سہرا بنا ہوا تھا کرن آفتاب کی
ناگہہ یہ رجز پڑھنے لگے قاسم جری / عالم میں کون ہے جو کرے ہم سے ہمسری
شہرہ ہے حرب و ضرب شہ خاص و عام کا / سکہ ہے شش جہت میں ہمارے ہی نام کا
جد ہے مرا امیر عرب شحنۂ نجف / دادی جناب فاطمہ زہرا سی ذی شرف
ہیں پارۂ دل حسن علی خوشخصال ہوں / ہیرے سے جو شہید ہوا اُس کا لال ہوں
ناگاہ فوج شام سے تیر ستم چلے / قاسم بھی چھیڑ کر فرس خوش قدم چلے
پیدل تو اُس قطار کے تھے کس قطار میں / دو دو سوار کٹ گئے ایک ایک وار میں
ڈھالیں اٹھیں کہ دن شب دیجور ہو گیا / لامع جو برق تیغ ہوئی نور ہو گیا
آئی ہنسی اجل کو بھی اس طرح مر گئے / گھوڑوں پہ تن چڑھے رہے اور سر اتر گئے
تھا ابن سعد شوم کو اُس دم بہت ہراس / غرق سلاح ازرق شامی کھڑا تھا پاس
اُس سے کہا کہ فوج نہایت ہے بے حواس / تو جا کے لڑ تو قتل ہو شاید یہ حق شناس
کہنے لگا بگڑ کے وہ با صد غرور و لاف / میں تب لڑوں اگر علی آئیں پئے مصاف
فرق آئے گا نہ میری کبھی آن بان میں / لڑکے سے لڑ کے نام مٹا دوں جہان میں
بیٹوں کو میرے بھیج کہ چاروں دلیر ہیں / جنگ آزما ہیں مرد ہیں صفدر ہیں شیر ہیں
نکلا یہ بات سنتے ہی اُن میں سے ایک یل / آگے چلی سر پہ اُسکے ہنستی ہوئی اجل
قاسم پہ نعرہ زن ہوئے چمکا کے راہوار / او خیرہ سر اجل تری گردن پہ ہے سوار
دشمن کو اپنی ضرب طمانچہ قضا کا ہے / آ کوئی وار کر جو ارادہ وغا کا ہے
یہ سنتے ہی کمان کو اٹھا کر بڑھا شریر / قاسم نے ماری فرق پہ شمشیر بے نظیر
یوں قطع انگلیاں ہوئیں اُس تیرہ بخت کی / جیسے کوئی قلم کرے شاخیں درخت کی
چٹکی سے چھوٹ کر جو چلا تیر بے اماں / قربان شیر کے ہاتھ کے چلائی یہ کماں

اک دم میں دی شکست خطا کو ثواب نے
مرکب سے گر کے مر گیا جب وہ عمارۂ دیں
نیزے کا وار کرنے لگا جب وہ خود پسند
نیزے سے کور ہو گیا جس دم وہ خیرہ سر
جز موت کچھ شقی کو نہ اُس دم نظر پڑا
جھپٹا برادرِ سوم اُس کا بکر و شمر
یوں دو کیا عمود سے سرِ نابکار کو
مرتے ہی اُس کے فوج سے چوتھا پسر بڑھا
لڑتا وہ کیا کہ تیرِ اجل کا نشانہ تھا
بیجاں ہوئے نبرد میں بیٹے جو اُسکے چار
جیب قبا کو شکلِ کفن پھاڑتا ہوا
شانے پہ تھی شقی کے وہ دو ٹانک کی کماں
کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بدخصال میں
فوجیں ادھر دعا کی چلیں سوئے آسماں
ہے اُسکی فتح ساتھ میں ہوں جس پہ [illegible] کی
قاسم نے دی صدا کہ لیں اب کر زباں کو بند
دیکھیں بلند کون ہے اور پست کون ہے
بیٹوں کے غم نے کر دیے مختل ترے حواس
چٹکیں میں چلتے سانپ وہ ڈستے نہیں کبھی
قایل کیا جو معجزت ناطق کے لال نے
تکنے لگے صفوں سے جواں سب لڑے ہوئے

غل تھا قفس کی تیلیاں توڑیں عقاب نے
نکلا اُدھر سے تب پسرِ ثانی لعین
بجلی سا کوندنے لگا قاسم کا بھی سمند
چنگے میں ہاتھ ڈال کے پٹکا زمین پر
آنکھیں کھلیں تو نعش بہت سم نظر پڑا
تانے ہوئے وہ گرز گراں سر کہ المحذر
جس طرح تیغ تیز اڑا دے خیار کو
قاسم پکارے اولی خود سر کدھر بڑھا
اک ہاتھ میں نہ سر تھا نہ بازو نہ شانہ تھا
ارزق کا دل ہوا صفتِ لالہ داغدار
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا
ارجن بھی جس سے سہم کے گوشہ میں ہو نہاں
پکڑا ہی پیل مست کو لوہے کی جال میں
بل کھا کے اُس طرف یہ پکارا وہ بدزباں
سرمہ کیا ہے دیو کو چٹکی میں میں نے کے
اللہ کو غرور و تکبر ہے ناپسند
کھل جائے گا ابھی کہ زبردست کون ہے
گھبرا کے کھینچتے ہیں تجھے بھی انہیں کے پاس
گرجے ہیں جو بہت وہ برستے نہیں کبھی
تر کر دیا اُسے عرقِ انفعال نے
عباسؑ نامدار قریب آ کھڑے ہوئے

نیزہ ہلا کے جانب قاسم بڑھا وہ پل
ضیغم ہیں بیشۂ اسد ذوالجلال کے
یہ کہہ کے اینچ چھوٹے سے نیزہ کو دی نکال
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
قاسم نے زور سے جو انی پرکھی انی
اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس نکان سے
جھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
چمکا کے تیغ تیز جو قاسم سنبھل گئے
مانند شیر غیض میں آیا وہ پیلتن
میخیں زمیں کی اسکی تگاپو سے ہل گئیں
دشمن کو کیا نبرد میں جانے کی آس ہو
چھل بل دکھا کے فوج کو دوڑا تھا اڑا
جن تھا پری تھا سحر تھا آ ہوشکار تھا
دونوں طرف سے چلنے لگے وار یک بیک
چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد
لایا جو حرف سخت زباں پر وہ بد خصال
او چھبر لگی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑا ابھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
غازی نے دی صدا کہ وہ مارا ذلیل کو

دو ہاتھ نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل
کیجو سناں کے وار ذرا دیکھ بھال کر
چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا
بھاگا شقی کے جسم سے زور تہمتنی
گرتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا اچپا کے سر
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا
سمجھا جو کچھ فرس کے بھی تیور بدل گئے
چلائے سب کہ گھوڑے کو بھی لو چڑھا ہے رن
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں
لڑنے کٹاریاں یہ فرس جسکے پاس ہو
صورت بنائی جست کی سمٹا جما اڑا
گویا ہوا کے گھوڑے پہ گھوڑا سوار تھا
دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک
یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی
تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جھپٹا مثال شیر درندہ حسن کا لال
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیئے سر پر سمند کے
مارا کمر پہ ہاتھ تو دو ہو کے گر پڑا
بچے نے آج پست کیا مست پیل کو

رجز

عرب کی جنگوں میں رجز خوانی کا عام دستور تھا ہر بہادر اور ہر پہلوان اپنے مقابل کے سامنے اپنے قبیلہ اور اپنے خاندان کی بہادری کا فخر اور اپنی شجاعت و شرافت کا ذکر کرتا تھا عربی کی شاعری میں رجز کا خاص حصہ شامل ہے۔ شعرائے اُردو میں یہ حصہ مرثیہ گویانِ لکھنؤ کے سوائے کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔ اُن میں بھی میر انیس کے بیان رجز نے اُردو کو خاص فخر کا موقع دیا۔ ایسے ایسے رجز لکھے کہ انسان پڑھے اور پہروں جھومتا رہے۔ پہلے عربی میں امام حسین علیہ السلام کا رجز ملاحظہ ہو۔

امام حسین علیہ السلام کا رجز[1]

کفر القوم وقدما رغبوا — عن ثواب اللہ رب الثقلین

کفر اختیار کیا اُس قوم نے اور پہلے ہی سے — یہ ثواب پروردگار عالم سے منحرف تھی

قتل القوم علیًا وابنہ — حسن الخیر کریم الطرفین

اُس قوم نے علی اور اُن کے فرزند — حسن کو قتل کیا جو ہم میں خیر تھے اور کریم الطرفین تھے

حنقًا منھم وقالوا اجمعوا — حشر الناس الی حرب الحسین

قتل انکا محض عداوت کے سبب تھا اور کہا اُن لوگوں نے — کہ بلاؤ گروہ ناس کو جنگ حسینؑ کے لئے

یالقوم من اناس رُذّل — جمعوا الجمع لاھل الحرمین

کس قدر یہ قوم ذلیل ہے جنہوں نے — ایسا اجتماع اہل حرمین کے واسطے کیا ہے

وابن سعد قد رمانی عنوۃً — بجنود کوکوف الھاطلین

اور ابن سعد نے مجھ پر قہراً ایسی افواج کا ہجوم — کر دیا جنگی کثرت مثل بارش باران کی ہے

[1] منقول از کتاب شہید اسلام تصنیف مولوی سید ہارون صاحب مطبوعہ عماد الاسلام لکھنؤ ۱۲

لا لشیٔ کان منی قبل ذا   غیر فخری بضیاء الفرقدین

اس سے پہلے مجھ سے کوئی خطا نہیں ہوئی تھی سوا اسکے کہ میں دو ستاروں (علی و نبی) کی ضیا و روشنی پر فخر کرتا تھا

بعلی الخیر من بعد النبی   والنبی القرشی الوالدین

ایک تو علی کے سبب مجھے افتخار تھا جو بعد نبی   سب سے بہتر تھے اور نیز نبی قرشی الاصل کے سبب سے

خیرۃ اللہ من الخلق علی   ثم امی فانا ابن الخیرین

پسندیدہ خدا خلق میں علی ہیں پھر میری والدہ اور میں دو منتخب اور پسندیدہ بزرگواروں کا فرزند ہوں

فضۃ قد خلصت من ذہب   فانا الفضۃ وابن الذہبین

میری مثال چاندی کی ہے جو سونے سے علیحدہ کی گئی ہے پس میں ایک نقرہ (چاندی) ہوں اور فرزند دو سونوں یعنی علی و فاطمہ کا فرزند ہوں

من لہ جد کجدی فی الوریٰ   او کشیخی فانا ابن العلمین

دنیا میں کون ہے جس کا نانا مثل میرے نانا کے ہو   یا مثل میرے باپ کے ہو پس میں دو نامور رہبر کا فرزند ہوں

فاطمۃ الزہراء امی وابی   قاصم الکفر ببدر وحنین

فاطمہ زہرا میری ماں ہیں اور باپ میرا وہ ہے   جس نے بدر و حنین میں کفر کے ٹکڑے اڑا دیئے

عبد اللہ غلاما یافعا   وقریش یعبدون الوثنین

اور جس نے لڑکپن سے خدا کی عبادت کی   حالانکہ اسوقت قریش دو بتوں کی عبادت کرتے تھے

یعبدون اللات والعزیٰ معا   وعلی کان صلی القبلتین

قریش لات و عزیٰ کی عبادت کرتے تھے اور علی نے اسوقت تک دونوں قبلوں (بیت المقدس اور بیت الحرام) کیطرف نماز پڑھ لی تھی

فابی شمس وامی قمر   وانا الکوکب وابن القمرین

پس میرا باپ آفتاب اور ماں میری ماہتاب ہے   اور میں ستارہ ہوں اور شمس و قمر کا فرزند ہوں

ولہ فی یوم احد وقعۃ   شفت الغل بفض العسکرین

جنگ احد میں انکا ایسا حملہ ایسا تھا جسنے   دونوں لشکر دشمن کو درہم برہم کرکے سوزش دلی تسکین کی

ثم فی الاحزاب والفتح معًا کان فیہا حتف اہل قلبتین

پھر جنگ احزاب میں اور فتح خیبر کے دن جس میں برابر اہل قلبتین مارے جارہے تھے

فی سبیل اللہ ماذا صنعت امۃ السوء معا بالعترتین

یہ سب خدا کی راہ میں تھا کیا کیا اس امت بد نے عترتین کے ساتھ

عترۃ البر النبی المصطفٰی وعلی الورد یوم الجحفلتین

یعنی عترت رسول مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ اور عترت کے ساتھ لشکر قریش تیغیں کے اجتماع کے دن

میرانیس کی معجز بیانی

امام حسینؑ کا رجز

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبر ہمیں بخشا

سرداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا
قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا

ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا
تخت بن داؤد مصلا ہے ہمارا

کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے

کس مرحلہ صعب کو سر کر کے نہ آئے
تھی کون سی شب جسکو سحر کر کے نہ آئے

تھا کون جو ایماں تہ صمصام نہ لایا
اُس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

اصنام کبھی کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے
بدکیشوں نے سجدے کبھی کر دینا تھے کبھی چھوڑے

طاقت تھی کیا عزی کو کوئی لات سے توڑے
سب توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ چھوڑے

کعبہ کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے
نکلے اسد اللہ اذاں دے کے حرم سے

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار
کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار
بجلی کی تو بجلی ہے یہ تلوار کی تلوار
قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

گر فیض ظہور شہ لولاک نہ ہوتا
بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا
ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا
یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا

رجز امام

تم نار ہو میں نور خدائے دو جہاں ہوں
تم ننگ جہاں میں شرف کون و مکاں ہوں
تم جنگ میں روباہ ہو میں شیر ژیاں ہوں
تم کاہ سے کمزور ہو میں کوہ گراں ہوں
لاکھوں ہوں تو ہے فتح بہر کیف ہماری
کرتی ہے صفیں صاف سدا سیف ہماری

فخر عرب و روم و عجم کی ہے یہ تلوار
کاٹے ہیں نشاں جس نے علم کی ہے یہ تلوار
کاٹ اس میں غضب کا ہے ستم کی ہے یہ تلوار
مثل مہ نو بدر میں چمکی ہے یہ تلوار
ہلتی نہیں زیں ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
خندق کو اسی تیغ نے لاشوں سے بھرا تھا

پائی نہ اماں لشکر صفین و جمل نے
عنتر کو جلایا ہے اسی تیغ اجل نے
نہ لات نے مرحب کو بچایا نہ ہبل نے
کاٹا شجر کفر کو اس تیغ کے پھل نے

رکھتی ہے نہ جوشن پہ نہ کھنتی ہے کمر پر
یہ مرگ مفاجات سے جلد آتی ہے سر پر

امام حسینؑ کا رجز

کس کے پدر کا نام جناب امیرؑ ہے
کس کا پدر رسول خدا کا وزیر ہے
وہ کون ہے جو صاحب تاج و سریر ہے
کون و مکاں میں کون بشیر و نذیر ہے

بنیاد کفر کس نے جہاں سے مٹائی ہے
کس نے نبی کے دوش پہ معراج پائی ہے

ہیں کس کے نام صفدر و کرار مرتضیٰ
ذی علم و ذی سعادت و ذی النصر ذی العطا
شیر و شجاع و صابر و معصوم و مقتدا
منصور وارقیا و بلیلا و ایلیا

باذل وہی مظفر و منصور ہے وہی
غالب وہی ہے طور وہی نور ہے وہی

والد بہترین عرب ہے مرا پدر
روز ازل سے عاشق رب ہے مرا پدر
عالی حسب بلند نسب ہے مرا پدر
ایجاد آسماں کا سبب ہے مرا پدر

ہے حکم مثل کعبہ مرے احترام کا
فرزند ہوں میں مشعر و رکن و مقام کا

دلبند مکہ و عرفات و منا ہوں میں
میرا ادب کرو خلف مرتضیٰ ہوں میں
حق ہے مرا کلام زبان خدا ہوں میں
مشکلکشا کا لال ہوں مشکلکشا ہوں میں

میزان مغفرت میں گناہوں کو تول دوں
عقدے جو لاکھ ہوں تو اشارے میں کھول دوں

وہ کس کی والدہ ہے جو ہے بضعۃ الرسول
مرضیہ و رضیہ و صدیقہ و بتول ہے

مریم کی عرض ہوئی تھی جس طرح سے قبول
سب مرتبے وہی تھے خدا سے انھیں حصول

قرآں میں کون نورِ سماوات و ارض ہے
طاعت وہ کس کی ہے جو زمانہ پہ فرض ہے

میں پارہ جگر ہوں بشیر و نذیر کا
سب ہے مجھ میں علم و فضل جناب امیر کا
میں نور ہوں جہاں میں سراج منیر کا
واللہ پیشوا ہوں صغیر و کبیر کا

اس میں بھی مصلحت ہے جو مظلوم آج ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں سرِ عالم کا تاج ہوں

حضرت عباسؓ کا رجز

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو
لے تیغ میان سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو
آ سکے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو

دو ہاتھ میں علی کے پسر وار پار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

ہم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں
شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک کو دم جنگ و جدال دیں
پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں

منہ دیکھتے ہیں جو ہیں نگہبان گھاٹ کے
لیجائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر
دادا شجاع باپ جوانمرد ہم دلیر
جب رن پڑا ہے کردیئے ہیں زخمیوں کے ڈھیر
لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر

عفریت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیر العلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں
سر کاٹتے ہیں پھیر کے تیغوں کی آب میں
فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بارگاہِ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیئے ہیں عرب کی سپاہ کے

حضرت عباسؓ کا رجز

جب گھر سے پئے جنگ قدم ہمنے نکالے
کعبہ سے دعا کر کے صنم ہمنے نکالے
دم میں تنِ کفار کے دم ہم نے نکالے
اسلام کے لشکر کے علم ہم نے نکالے
رنگِ رخِ کفارِ عرب ہوگیا فق سے
اک ضرب میں باطل کو جدا کر دیا حق سے

میں حشمتِ دنیا کی تمنا نہیں رکھتا
اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا
قطرے کی طمع فیض کا دریا نہیں رکھتا
پتے سے علاقہ سرِ طوبیٰ نہیں رکھتا
کعبے کی طرف صاحبِ ایماں نہیں جاتے
بتخانے میں کعبے سے مسلماں نہیں جاتے

کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
مس پہ جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

دولت نہیں انسان کی کچھ قدر بڑھاتی
گو فقر ہو عالی نسبی پر نہیں جاتی
دنیائے دنی کام کسی کے نہیں آتی
بینا جو ہیں وہ دیکھتے ہیں جوہرِ ذاتی
محتاجی سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا

عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

علی اکبرؓ کا رجز

تازی کو تیز کر کے یہ اکبر نے دی صدا
انساں کو آپ اپنی ستائش نہیں روا

او خود گرفتہ کچھ تجھے دعویٰ ہو گر تو آ
قائل ہیں جس کے سب وہ ہمارا ہے مرتبا

ذی قدر ہیں سعید ہیں عالی جناب ہیں
ذرے بھی جانتے ہیں کہ ہم آفتاب ہیں

یوسف نہیں ہے وہ جو کرے دعوئ جمال
پایا ہے آفتاب نے کیا اوج کیا جمال

کب بدر نے کہا کہ میں ہوں صاحب کمال
کی سرکشی ادھر کہ اُدھر ہو گیا زوال

شیطاں کو وصل نار کا آدم کو نور کا
یہ عجز کا ثمر ہے وہ پھل ہے غرور کا

ظالم کسی کے فخر کو ہم مانتے ہیں کب
کس کا ہے جد شفیع امم سید عرب

روشن ہے آفتاب سے اپنا حسب نسب
ہم سے بزرگ کوئی نہیں غیر ذات رب

جو دست ہے خدا کا پسر اُس ولی کے ہیں
کافی ہے بس یہ فخر کہ پوتے علیؓ کے ہیں

علی اکبرؓ کا رجز

روشنگر آئینۂ دیں ہیں تو ہمیں ہیں
اور بعد نبیؐ تخت نشیں ہیں تو ہمیں ہیں

گر مہر نبوت کے نگیں ہیں تو ہمیں ہیں
اسرار الٰہی کے امیں ہیں تو ہمیں ہیں

قدسی ہیں معرف سحر و شام ہمارے
جو عرش پہ لکھے ہیں وہ ہیں نام ہمارے

اللہ نے سب طرح کی دولت ہمیں دی ہے
کونین کو بخشی وہ شرافت ہمیں دی ہے
عزت ہمیں بخشی ہے شرافت ہمیں دی ہے
قایل ہیں عرب جسکے وہ جرأت ہمیں دی ہے
روباہوں کے حیلوں سے تردد ہمیں کیا ہے
ہم شیر ہیں اُس شیر کے جو شیر خدا ہیں

زیبا ہے ہمارے ہی لئے رتبہ شاہی
ہے آل محمدؐ کا غضب قہر الٰہی
ہیں حکم شریعت کے ہمیں امر و نواہی
برہم ہوں تو آجائے زمانے پہ تباہی
برق غضب حضرت باری نہیں رکتی
لاکھوں سے کبھی تیغ ہماری نہیں رکتی

عونؑ و محمدؑ کا رجز

تلوار جنھیں حق نے عطا کی ہے وہ ہم ہیں
خوجن میں شہ عقدہ کشا کی ہے وہ ہم ہیں
جن غازیوں نے دیں کی بنا کی ہے وہ ہم ہیں
دولت جو رسولِ دوسرا کی ہے وہ ہم ہیں
کیا عرش الٰہی پہ جگہ آج ملی ہے
کاندھے پہ نبیؐ کے ہمیں معراج ملی ہے

بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے
عالم کو طلبگارِ خدا کر دیا کس نے
دم میں حق و باطل کو جدا کر دیا کس نے
اسلام کی قوت کو سوا کر دیا کس نے
در کفر کا خالق کی عنایات سے توڑا
عزّیٰ کا سر نحس و نجس لات سے توڑا

تقسیم ہوئی دولتِ دیں گھر سے ہمارے
ہے پیش نظر خلد بریں گھر سے ہمارے
شاہوں کو ملے تاج و نگیں گھر سے ہمارے
تعلیم ہوا روحِ امیں گھر سے ہمارے
دیر آئے کہ مسکن تھا بہت دور ہمارا

آدم سے جو پہلے تھا وہ ہے نور ہمارا

خوشنود رہا ایزد باری اسی گھر سے — سب سیکھ گئے شکر گزاری اسی گھر سے
کفار ہمیشہ رہے عاری اسی گھر سے — احکام ہوئے شرع کے جاری اسی گھر سے

آتے ہیں زباں پر وہی جو کلمۂ حق ہیں
ہم مصحفِ ناطق کے صحیفہ کے ورق ہیں

تیغوں کو جو کھینچیں تو صفیں دم میں الٹ جائیں — آگے جو بڑھیں ہم تو پرے فوج کے ہٹ جائیں
سر تن سے سواروں کے ہر اک ضرب میں کٹ جائیں — للکاریں تو شیروں کے کلیجے ابھی پھٹ جائیں

امت پہ کرم ورنہ بحکمِ شہِ دیں ہے
ناچار ہیں سبقت کا ہمیں حکم نہیں ہے

مناجات

فارسی اور اردو میں بہت سی مناجاتیں نظر آتی ہیں جن میں اکثروں کا یہ حال ہے کہ وہ مصنف کے شاعرانہ خیال کا نمونہ ہیں۔ مثلاً ایک شاعر ہے کہ اس نے عاشق بن کر عشق کے سوز و گداز کا اظہار کیا ہے جو اس کے دل میں نہیں یا کسی سخن طراز نے صوفی بن کر اپنے کلام کو صوفیانہ رنگ میں ڈوب دیکر نکالا ہے حالانکہ وہ فی الحقیقت عرفان و تصوف سے نا آشنا ہے یا بعض داعیوں نے مناجات میں خدا سے چشم گریاں و خاطر بریاں دیدۂ پر آب و دل بیتاب کی آرزو کی ہے اور چاہا ہے کہ اے خدا مجھکو ایسا دل دے جو درد سے بھرا ہوا اور وہ آہِ شرربار عطا کر جس کی ایک چنگاری ماسوا اللہ کو پھونک ڈالے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میر انیس نے مناجات میں بھی اپنے قال کو اپنے حال کے موافق ظاہر کیا ہے۔ اور خدا سے وہی سامان مانگا ہے جو میر انیس جیسے زبان آور سی مناسبت

صحیح رکھتا ہے اور جس سے ایک شاعر کی سچی فطرت اور اس کی صحیح آرزو کے منشا و مقصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر انیس نے کئی مقام پر مناجات کے بند لکھے ہیں اُن میں سے ایک مناجات کے چند بند لکھے جاتے ہیں۔

میر انیس کی مناجات

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر
اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نجائے
اقلیمِ سخن میرے قلمرو سے نجائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری
بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری
پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی
ہو جن کی جگہ تاج سرِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی
عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی
سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کے یہ ہونگے جنہیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درج دہاں کو
دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو
عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حُسن بیاں کو
تحسین کا سموات سے غل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور چلیں جام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایام
جس میں عوضِ نشہ ہو کیفیتِ انجام
صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام

ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آگئی ہے خلدِ بریں سے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم
خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا ماہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی
عالم کو دکھا دے بُرشِ سیفِ الٰہی
لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

میر انیس کی سیف زبانی

ناظرین غور سے پڑھئے اور انصاف کیجئے کہ میر انیس مرحوم نے تلوار کے کیا کیا مضمون نکالے ہیں جو نہ فردوسی کو نصیب ہوئے اور نہ شاہنامۂ نظامی میں نظر آتے ہیں۔ غالباً آپ کو کسی زبان میں یہ دلنشین مطالب ڈھونڈے سے نہ ملیں گے۔ یہ معجزۂ کلام نہیں تو کیا ہے۔

شمشیر آبدار

بے پانوں جیدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی

دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

زیبا تھا دم جنگ پریوش اُسے کہنا
معشوق ہی سرخ لباس اُس نے جو پہنا
اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا
جوہر تھے کہ پہنے تھی دلہن پھولوں کا گہنا
سیب چمنِ خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شبیر سے دولہا کی بغل میں

ہر ڈھال کے پھولوں کو اڑاتا تھا پھل اُس کا
تھا لشکر باغی میں ازل سے عمل اُس کا
ڈر جاتی تھی منہ دیکھ کے ہر دم اجل اُس کا
تھا قلعۂ چار آئینہ گویا محل اُس کا
اس در سے گئی کھول کے وہ در نکل آئی
گہ صدر میں بیٹھی کبھی باہر نکل آئی

پہنچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی کھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئی جاتی تھے سب کے
قینچی سی زبان چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

تلوار

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دو سر گری
کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری
سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفوں کی صفیں خاک ہو گئیں

پڑتی تھی جس کے فرق پہ وہ تیغ سر شگاف
ہوتا تھا سر سے مثلِ قلم تا جگر شگاف

تا سینہ کوئی اور کوئی تا کمر شگاف — چار آئینہ کسی کا کسی کی سپر شگاف

سر تھا اگر تو ہاتھ کا تن پر اثر نہ تھا
ثابت کسی کے ہاتھ اگر تھے تو سر نہ تھا

اک برق سی چمکتی تھی بالائے سطح آب — گاہے سوئے سمک تو کبھی جانب سماک
جوشن تو پارہ پارہ تھے اور جسم چاک چاک — دم لیتی تھی نہ تیغ نہ رکتا تھا دست پاک

ڈر سے اسی کے کفر کی بنیاد پست تھی
اسلام کو ظفر تھی بتوں کو شکست تھی

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطان بحر و بر — اڑتی تھی کٹ کے صورت کاغذ ہر اک سپر
چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتے تھے خاک پر — قبضوں سے تیغیں جسم سے روحیں تنوں سے سر

پے تھے قدم گریز کے رستے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تیز تھے اعدا سپند تھے

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کے اس تیغ کی چمک — بھاگے شعاع مہر سے جس طرح شپرک
اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک — چمکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پر ملک

ہر شے تھے خوف جاں سے خضوع و خشوع میں
سجدہ میں تھی زمیں تو فلک تھا رکوع میں

جانوں کو چھوڑتی نہ تھی وہ تیغ برق دم — تھی اس کی تاب جادۂ سر منزل عدم
ہر جوہر اس کا دیدۂ بینا سے تھا نہ کم — اعدا کو ڈھونڈتی تھی وہ قد اس لئے تھا خم

تھی موج بحر قہر خدا دار و گیر میں
سیل فنا کا ابال تھا اس کے خمیر میں

بجلی سی کوند کر جدھر آئی جلا گئی — دم میں چراغ راہ ضلالت بجھا گئی
لشکر میں فرد فرد کو جوہر دکھا گئی — خوں سے بھرا نہ پیٹ تو لوہے کو کھا گئی

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اوج سے
پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے

چلاتی تھیں کمانیں کہ کس جا ہوں گوشہ گیر — ہم تو خطا شعاروں کے قبضے میں ہیں اسیر
چلّے میں سب زہ کا نپٹتے تھے مثل پائے پیر — سہمے ہوئے نکلتے نہ تھے ترکشوں سے تیر
دم بند خنجروں کے بھی تھے اُس مصاف میں
تیغیں چھپی تھیں خوف کے مارے غلاف میں

تلوار

جس فرق پر چمک کے وہ برق اچھل گئی — بوسہ زمینِ پاک کو دے کر نکل گئی
جس صف کو آنچ لگ گئی اُسکی وہ جل گئی — کاٹا کسی کو گر تو کسی کو نگل گئی
ضربت پہ عقل دیکھنے والوں کی دنگ تھی
افعی کسی جگہ تو کسی جا نہنگ تھی

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر — بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں لہو کی نہر
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کی جسکی نہیں ہے لہر — اتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر
زخموں سے جسم ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندانِ مار ہیں

سر پر پڑی فرس کے تو سوئے کفل چلی — وہ منہ کے بل زمیں پہ چلا یہ نکل چلی
بجلی سی جب لعیں پہ چپلی پھسل چلی — پہنچی ادھر سے تیغ اُدھر سے اجل چلی
دو آفتوں نے دشمنِ دیں کو دبا لیا
سر تیغ نے لیا تو اجل نے گلا لیا

جب حملہ ور امام مسیحا نفس ہوئی — نیچے ہوئے سوار تو اوپر فرس ہوئے
کشتوں کے ڈھیر دو چپ و راست پیش و پس ہوئی — پانچ آ گئے جو تیغ کے نیچے تو دس ہوئے

کشتوں کی شکل خوں سے جو روپوش ہو گئی
گننی اجل کو اُن کی فراموش ہو گئی

تلوار

افعی کی طرح منہ سے نکالے تھی زباں تیغ — ہر دم صفِ کفار پہ تھی شعلہ فشاں تیغ
گرتی تھی چمک کر کبھی یاں اور کبھی واں تیغ — چھپتے تھے جنہیں جو یہ دیتی تھی اماں تیغ
قبضے میں جو سب فوج تھی اُس تیغ دوسر کے
بچ سکتے تھے دشمن نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

پیش وہ کہ لشکر کو پریشاں کیا جس نے — آب ایسی کہ خشکی میں یہ طوفاں کیا جس نے
دم ایسا کہ سب فوج کو بیجاں کیا جس نے — بر ایسا کہ جنگل کو گلستاں کیا جس نے
سر سکڑوں کاٹے تھے پہ رنگ اُس کا ہرا تھا
ہر ناب میں ناگن کی طرح زہر بھرا تھا

قبضہ وہ جسے رکھتے تھے قبضے میں ید اللہ — نابوں سے عیاں تھا کہ عدم کی ہے یہی راہ
جو ہر وہ کہ ہر فرد بشر جس سے ہو آگاہ — فتنہ آفتِ دوراں برش الغلطۃ للہ
باڑھ ایسی مقابل کبھی دریا نہیں جس سے
گھاٹ ایسا کہ جیتا کوئی اترا نہیں جس سے

وہ سیل جدھر آئی طلاطم نظر آیا — آنکھوں سے نہاں ہیچ مردم نظر آیا
ہلچل میں سواروں کا پرا گم نظر آیا — جو تھا یہ سر زیں وہ تہِ سم نظر آیا
منہ کھول کے اژدر نے نوالہ کیا سب کو
بجلی کی تڑپ نے تہ و بالا کیا سب کو

تلوار

فوجوں کو دے جواب وہ تیزی زباں میں — ترکش میں چھوڑے تیر نہ چلے کماں میں

پانی وہ تھا کہ آگ لگا دے جہان میں
نازل ہوا تھا آیۂ برق اُس کی شان میں
بے فتح پھیرتی تھی نہ منہ کارزار سے
دعوے ہمسری تھا اُسے ذوالفقار سے

جوہر وہی برش کا وہی طور خم وہی
تیزی وہی غضب کی وہی کاٹ دم وہی
چلنا اُسی طرح کا چمک دم بدم وہی
رنگت زمردی وہی پانی میں سم وہی
بے مثل آبرو میں اصالت میں نیک تھی
ل جاتیں دو زبانیں بھی اُس کو تو ایک تھی

کاسے سروں کے ٹھوکریں کھاتے تھے جا بجا
تودے کانوں کے نظر آتے تھے جا بجا
گوشوں میں گورخوں کو چھپاتے تھے جا بجا
لیکن سروں پہ تیغ کو پاتے تھے جا بجا
بھاگیں نہ کس طرح قدر انداز سہم کے
واں تیر کیا کہ جلتے تھے پر مرغِ وہم کے

سبے تیغ کمانیں تیروں سے چلے کماں سے دور
مرغانِ تیر سے ہوئے آشیاں سے دور
برچھی سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دور
پیر دل سے عقل دور تہور جواں سے دور
رایت جھکے ہوئے تھے صفیں پائمال تھیں
کاندھوں پہ روسیاہوں کی ڈھالیں نڈھال تھیں

بھاگے تھے خود اپنی بلا سر پہ ٹال کے
بھالے چھپے تھے امن کی جا دیکھ بھال کے
تلواریں منہ چھپاتی تھیں دامن میں ڈھال کے
زرہیں تھیں یا کھلے ہوئے حلقے تھے جال کے
چار آئینے پڑے تھے زمیں پر کٹے ہوئے
لٹکے تھے جوشنوں کے گریباں پھٹے ہوئے

ٹکڑے مگر تھیں سپریں تو نشاں سب تھے سرنگوں
ثابت الف نہ تیروں کے تھے نہ کماں کے نوں
بھپا لہو کی آئی یہ برسا زمیں پہ خوں
چلاتے تھے زمیں پہ تڑپ کر سپہ دروں

تھراتے ہیں پہاڑوں کے دل اس کی کاٹ سے
ندی چڑھی ہوئی ہے سرک جاؤ گھاٹ سے

خالی سکے دلیر نے جنگل بھرے ہوئے
لہرا رہے تھے خون کے جل تھل بھرے ہوئے
سر اپنا گرے اُدھر تھے جا بجا دل بھرے ہوئے
جیسے کبھی برستے ہیں بادل بھرے ہوئے
اس زور و شور سے کبھی لڑتا نہیں کوئی
یوں دونگڑا اساڑہ میں پڑتا نہیں کوئی

چھائی ہوئی تھی ڈھالوں کی ہر سو گھٹا سیاہ
بجلی چمک رہی تھی کہ اللہ کی پناہ
چھپنے کی نے جگہ نہ کہیں بھاگنے کی راہ
ندی چڑھی تھی فوج کا بیڑا تھا سب تباہ
جو گھاٹ پر تھا خون میں وہ شور بور تھا
سارا یہ تیغ تیز کے پانی کا شور تھا

امام حسینؑ کی سلاح جنگ

بالائے دوشِ حضرتِ حمزہؓ کی ہے وہ ڈھال
زیبا ہو کیسے گر رخ فتح و ظفر کا خال
پھول اُسکے وہ کہ تیغ کا پھل جس سے پائمال
شب میں عیاں تھے چار ستارے تو اک ہلال
اس کو عروج کیوں نہ ملے قتل گاہ میں
پشت و پناہ خلق ہے جس کی پناہ میں

وہ آہنی کلاہ وہ زرہ جامۂ حضور
جس کی ہر اک کڑی سے نکلتا تھا چھن کے نور
حلقے وہ جن کو دیکھ کے شرمائے چشمِ حور
قندیل آہنی میں فروزاں ہے شمع طور
جوشن نہ تھا تنِ شہِ گردوں وقار میں
تارے چمکتے تھے شبِ تاریک و تار میں

شانے پہ کس شکوہ سے ہے حلقۂ کماں
ہے جیسے دور سے قوس قزح چرخ پر عیاں

پیغام موت کا ہے ہر اک تیرِ جاں ستاں
ہر دم صدا یہ ہے لبِ سوفار سے کہ ہاں
سرکش کہاں ہیں لشکرِ کج عقل و فہم کے
گوشوں میں چھپتے پھرتے ہیں کیوں سہم سہم کے

دستانہ ہے کہ قبضۂ سیفِ قضا ہے یہ
ہمدست آستینِ شہِ لافتا ہے یہ
شمشیر ہے زبان دہن اژدہا ہے یہ
ثابت ہوا کہ پنجۂ شیرِ خدا ہے یہ
دستِ خدا کے لال جری ہیں دلیر ہیں
اس ہاتھ سے جہاں کے زبردست زیر ہیں

نیزہ ہے رشکِ افعیِ گیسوئے دلستاں
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
سینے کو جس کے ڈر سے چراتا ہے آسماں
غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں
لشکر وہ دیو کا ہو تو دم میں ہلاک ہو
اس کی ہوا لگے تو بدن جل کے خاک ہو

تلوار

برسے اُدھر سے تیر تو کوندی اِدھر سے برق
چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق
وہ برق چپتی پھرتی تھی خود جس کے ڈر سے برق
روکیں کسے رکی ہے کسی کی سپر سے برق
جل تھل بھرے لہو کے نہ دیر اک گھڑی لگی
کیا ابرِ تیغ تھا کہ سروں کی جھڑی لگی

معجز نما تھی شاہ کی شمشیرِ آبدار
یاں برق واں ہوا تو اُدھر ابرِ رود بار
دکھلائی ماہِ سیف میں برسات کی بہار
بہیا کہیں لہو کہیں خوں کی آبشار
یوں سر برس گئے یہ روانی تھی باڑھ میں
تڑ ماہے وونگڑا کبھی جیسے اساڑھ میں

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
تھمتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے

پانی وہ خود پیے ہو سنتی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانتے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اڑا کے کلائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
کوندی گری زمیں میں سمائی نکل گئی
بجلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
چار آئینے کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
قبضے سے تیغ پر سے زرہ ہاتھ سے کمر
پہنچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
برچھی سے پھل کمان سے زہ زین سے تیر
ترکش کہیں پڑے تھے نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھے شست کہیں تھی سری کہیں

پہنچی ہم فرس پہ جو بالا سے سر گری
ناری جلے ادھر وہ جدھر کوند کر گری
چمکی ادھر زمیں سے نکل کر ادھر گری
جس صف سے لگ چلی یہ وہ صف خاک پر گری
دکھلا کے اوج جاتی تھی یوں ہر سوار پر
جنگل میں باز گرتا ہے جیسے شکار پر

بازو ہر اک کمان کا کمزور ہو گیا
ڈھالوں کا ابر خوں میں شرابور ہو گیا
تیروں کے سینہ پر سینے کا اک شور ہو گیا
جو تھا کنارِ نہر لبِ گور ہو گیا
مشقِ شناوری تھی قیامت بڑھی ہوئی
اتری وہ تیغ خون کی ندی چڑھی ہوئی

دم کی تھی دعا شاہ نے کیا تیغِ دو دم پہ
گردن سے جو بیٹھے پہ تو سینے سے شکم پہ
سر خود پہ گرتی تھی نہ تھمتی تھی علم پہ
توسن سے رکابوں پہ رکابوں سے قدم پہ

جوشن میں فتوحی میں نہ بکتر میں نہ زیں میں
سم کاٹ کے گھوڑے کے جو دیکھا تو زمیں میں

کس سر پہ چڑھی تیغ کہ توسن پہ نہ اُتری
بے جان سے اک جسم تہ تن سے نہ اُتری
وہ کونسا توسن تھا کہ جو زین سے نہ اُتری
اُتری جو نہ وہ موت کبھی گردن سے نہ اُتری
دشمن کو نہ زندہ کسی جا موت نے چھوڑا
تیغ اُتری کمر سے تو لگا موت نے چھوڑا

انبار تن و سر کے سراسر تھے زمیں پر
کاٹے ہوئے ہتیار برابر تھے زمیں پر
تن تھے کسی جا اور کہیں سر تھے زمیں پر
جوشن کہیں ٹکڑے کہیں مغفر تھے زمیں پر
بیجاں کہیں دو اہل ستم ساتھ پڑے تھے
ریتی پہ کہیں پاؤں کہیں ہاتھ پڑے تھے

ناری کو سقر تک کبھی پہنچا کے پھر آئی
ناگن کی طرح سن سے کبھی جا کے پھر آئی
دیکھا کسی موذی کو تو بل کھا کے پھر آئی
جاتا تھا کہ بس فوج پہ لہرا کے پھر آئی
غل تھا کبھی یوں تیغ کو چلتے نہیں دیکھا
افعی کو کبھی یہ زہر اُگلتے نہیں دیکھا

تلوار

بجلی کی چمک لشکر دشمن کو دکھائی
تیزی دم شمشیر نے جوشن کو دکھائی
شعلے کی لپک ناریوں کے تن کو دکھائی
کٹ کٹ گیا ایسی برش آہن کو دکھائی
کس طرح بھلا اہل ستم دنگ نہ ہو جائیں
چار آئینہ شمشیر سے تھے کہ جو زنگ ہو جائیں

سر اُڑ گئے گردن سے تو خود اُڑ گئے سر سے
بل پہ جھکے کٹ کٹ کے گرے پھول سپر سے
شانوں سے تو ڈھالیں زمیں پر گر گئیں بہ سے
دستانے تو ہاتھوں سے کمر بند کمر سے

اعدا کی صفیں خوف سے منہ موڑ کے بھاگیں
روحیں قفسِ جسم سے جی چھوڑ کے بھاگیں

چار آئینے والے برشِ تیغ سے تھے دنگ ‏ جوہر تھے عجب اور عجب آب عجب رنگ
پڑتی تھی جو سر پر تو ٹھہرتی تھی نہ تا تنگ ‏ اسوار تو اسوار فرس ہو گئے چو رنگ

غل تھا کہ دہن کھولے ہوئے صورتِ لا ہے
لو کھا گئی گھوڑے کو بھی منہ ہے کہ بلا ہے

جب خود پہ بیٹھی تو جھلم کاٹ کے اُٹھی ‏ دستانے کو مانند قلم کاٹ کے اُٹھی
جوشن پہ جو آئی تو شکم کاٹ کے اُٹھی ‏ سر پر جو پڑی تا بقدم کاٹ کے اُٹھی

بالا تھی وہ شمشیر ستمگار قمر دو تھا
دیکھا تو فرس بھی اسی اک ضرب میں دو تھا

بجلی تھی پہ جنگل کے لئے بن گئی جاروب ‏ کچلے گئے سر اُنکے جو تھے فوج کے سرکوب
نقارے تلک آتے ہوئے کانپتی تھی چوب ‏ ہیبت سے لرزتا تھا وہ صحرائے پر آشوب

شمشیر کے شعلے کی حرارت جو بڑی تھی
خورشید کو گردوں پہ تپ لرزہ چڑھی تھی

بجلی سی ہوا پر کبھی چمکی کبھی ٹھہری ‏ تھی عکس سے دریا کی ہر اک لہر سنہری
پایاب تھی خوں کی کہیں ندی کہیں گہری ‏ راحت میں نہ بری تھے نہ بحری تھے نہ شہری

جو خاکی و آبی تھا وہ تھا نوحہ گری میں
خشکی میں تباہی تھی تلاطم تھا تری میں

علی اکبرؓ کی تلوار

آئی جو سن سے سینہ کی جانب اڑا کے سر ‏ دھڑ سے گرا سمند کی ٹاپوں پہ آکے سر

مرکب نے کی نظر سوئے راکب اٹھا کے سر — نکلی وہ تیغ تیز بغل سے جھکا کے سر
ظالم نئی طرح سوئے دوزخ روانہ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ سپر تھی نہ شانہ تھا

جب آئی سن سے کاٹ کے جوشن نکل گئی — اڑ کر صفوں کے بیچ سے ناگن نکل گئی
یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی — شہ رگ سے جان، صدر سے گردن نکل گئی
سالم رگیں نہ جسم کی نہ استخواں رہے
ٹوٹے قفس میں طائر وحشی کہاں رہے

پھول اڑ گئے پھل اسکا جو چمکا سپر کے پاس — نکلی ادھر سپر سے کہ آ پہنچی سر کے پاس
سر سے اتر گئی دل بیداد گر کے پاس — دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس
کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں
زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

بل کھا کے اس طرف سے کوئی یل ہٹا اگر — پہنچا سمند اٹھا کے برابر وہ شیر نر
چمکی جو تیغ برق سی کوندی ادھر ادھر — آئی لہو میں پیر کے وہ ماہی ظفر
چھوڑا سوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب — آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کی شکم پر کہ اسکی ناب — تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جو اختر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی کبھی خون فوج کی اور آبدار بھی — غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی کبھی ابر کبھی خزاں بھی بہار بھی — تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی

پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفت جہاں تھی لگانے بجھانے میں

کرتی تھی پائمال صفوں کو وہ برق سیر
دہشت سے تھا سپاہ شقاوت کا حال غیر
نے خود کو پناہ نہ اُس سے سپر کی خیر
چار آئینہ سے لاگ تھی اُسکو سپر سے بیر
سکے پڑے تھے اکبر غازی کی حرب کے
لوہا بھی دب گیا تھا یہ معنی ہیں ضرب کے

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم
مثل قلم زبان دراز سناں دو نیم
چار آئینے کٹے ہوئے گرزگراں دو نیم
مغفر سے تا کمر جسد پہلواں دو نیم
سالم تھا پیش آئینہ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کون سا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صف کفار ہٹ گئی
چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو الٹ کر پلٹ گئی
رن کی زمیں لہو سے ڈھیریوں سے پٹ گئی
دریا بھی آب تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

علی اکبرؓ کی تلوار

اللہ ری زباں آوری تیغ بلا نوش
زرہیں ہمہ تن چشم تھیں ڈھالیں ہمہ تن گوش
گھاٹ ایسا کہ ڈر سے لب دریا بھی تھا خموش
باڑھ ایسی کہ ہیں مچھلیاں پانی میں زرہ پوش
کٹتے ہیں گلے تیز زبانی سے اسی کی
دریا بھی ہے چکر میں روانی سے اسی کی

نا ہیں وہ کہ نشہ رگ کسی گردن میں نہ چھوڑیں
دشمن کا گلا قلعہ آہن میں نہ چھوڑا

جوہر وہ کہ حلقہ کسی جوشن میں نہ چھوڑیں
پشتے وہ قیامت کہ لہو تن میں نہ چھوڑیں

منہ وہ ہے کہ دم سے شفا خوں بہتی ہو جسکے
قبضہ وہ ہے قبضہ میں ظفر رہتی ہے جسکے

ہم چشم تھا ابرو سے حسینوں کی خم اسکا
ناگن تھی اترتا ہی نہ تھا چڑھ کے سم اسکا
اللہ ری چمک برق بھی بھرتی تھی دم اسکا
ہر ہاتھ میں ہاتھ اس کا تو بازو قلم اسکا

جوہر کی چمک دیکھی نہ ہیروں کی نگوں میں
یوں دوڑتی تھی تن میں لہو جیسے رگوں میں

اک برق سی گرتی تھی ہر اک دشمنِ جاں پر
ترکش پہ کبھی سن سے گئی گاہ سناں پر
گہہ سر پہ گئے ڈھال پہ تھی گاہ سناں پر
کس طرح بھلا ذکر برش لاؤں زباں پر

دل سے کہیں جینے کی ہوس قطع نہ ہو جائے
دم بند ہے ڈر سے کہ نفس قطع نہ ہو جائے

لوہے سے اسی تیغ کے آئینہ بنے گر
پائے نہیں اب تک کسی حرب نے یہ جوہر
عکس اس میں جو دشمن کا نظر آئے تو بے سر
ذکر اس کی برش کا جو مسافر کے ہو لب پر

قطاع طریق آئے تو وہ خوف سے ہٹ جائے
کیسی ہی کڑی راہ ہو اک آن میں کٹ جائے

حضرت عباسؓ کی تلوار

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا
بجلی سا جس جگہ فرس تیز گام تھا
یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
ششدر تھی موت چار طرف قتل عام تھا

اس غول پہ کبھی تھی کبھی اس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

منہ پھر گئے سپاہ کے جس سمت رخ کیا
یاں سے وہاں گئے اسے مارا اُسے لیا
باقی رہے ہزار میں سو دس میں اک جیا
اللہ رے دم لہو پہ لہو تیغ نے پیا
اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکین ذری ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اُسکے بھری ہوئی

چلتا تھا مثل برق یمین و یسار ہاتھ
ڈر ڈر کے جوڑتے تھے ضلالت شعار ہاتھ
ان کی نہ ایک چوٹ نہ اُنکے ہزار ہاتھ
کافی تھے سب کو تیغ دو دستی کے چار ہاتھ
آواز شش جہت میں تکبیر و بزن کی تھی
اللہ کا کرم تھا مدد پنجتن کی تھی

نعرہ جدا صدائے تکبیر و بزن جدا
گوشے کماں سے دور تھے گوشو نسی زہ جدا
یکسر جدا زمیں پہ ٹکڑے زرہ جدا
شیروں کو دیکھئے تو گرہ سے گرہ جدا
اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

نیزے سے اُدھر قلم تو ادھر برچھیاں قلم
ترکش دو نیم ٹکڑے کمانیں نشاں قلم
ہر ہاتھ میں قلم کی طرح استخواں قلم
منہ تیغ کا خراب سناں کی زباں قلم
جب سن سے سر پہ آئی کسی بدخصال کی
گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

وہ تیغ کھول دیتی تھی لوہے کا بھی حصار
تھا اُس کے ہاتھ سے دل چار آئینہ فگار
عاری تھیں منہ پہ تیغوں کے ایسے پڑے تھے وار
خود اپنے سر پٹکتے تھے گر گر کے بار بار
پانی وہ زہر تھا کہ پیا اور فنا ہوا
سینے آج تک زرہ کا کلیجہ چھنا ہوا

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس
بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس

قبضے کے پاس تیغ نہ دستہ کمر کے پاس — کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس

نیزے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھا نہ چلہ کمان پر

حضرت عباسؓ کی تلوار

کھا کھا گئی صفوں کو برابر لڑائی میں — ٹھہری نہ سب کے لہو پیئے دم بھر لڑائی میں
ثابت رہے تھے جن کے قدم ہر لڑائی میں — پہلے انہیں کے کاٹ گئی سر لڑائی میں

دو ٹکڑے ہو کے گرتا تھا جو راہوار سے
یہ اٹھ کے داد مانگتی تھی ذوالفقار سے

جس غول پر گری نہ تھمی نار کی کہیں — اک دم بھی کی نہ اسکی برش نے کمی کہیں
چمکی کہیں کسی پہ کسی جا رہی کہیں — فوجوں میں ابتری تھی کہیں ہمہمی کہیں

کاٹے ہوئے نشاں تھے زمیں پر پڑے ہوئے
ہر جا تھے ضرب تیغ سے جھنڈے گرے ہوئے

جب وار چل گیا سپر آہنیں کٹی — دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی
مغفر کٹا دو نیم ہوا سر جبیں کٹی — سینے کو لے کے زین سے جا اتری زمیں کٹی

چورنگ تھا فرس تو دو پارا سوار تھا
اللہ رے منہ کہ تیغ نے جانا شیار تھا

آئی جدھر لہو میں سراسر بسی ہوئی — خالی صفوں میں اور سوا ابتری ہوئی
بیجاں تھا جس پہ سایہ فگن وہ پری ہوئی — پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل بھی ڈری ہوئی

آنچ اس کی تھرتھری کو کوئی کیونکر لگا نہ جائے
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اسکی لگ نہ جائے

پلٹی اُدھر سے جب تو اُدھر کا پرا نہ تھا
کاٹے تھے سر پہ فرق بریش میں ذرا نہ تھا

چھلکا ہوا تھا سم بدن اُس کا بھرا نہ تھا
خوں سب کا پی گئی تھی مگر دم بھرا نہ تھا

سیل فنا تھا جنگ میں کاٹ اُس کی دھار کا
دم خم تھا گھاٹ باڑھ میں سب ذوالفقار کا

گو را دہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک
تھی صاف تیغ حیدر کرار کی چمک

موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک
اُس پار تک پہنچتی تھی اس پار کی چمک

اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم فرات میں

بے سر تھا جس کے فرق پہ وہ جانگزا لگی
اک آگ تھی کہ چنبر گردوں میں جا لگی

چار آئینہ پہ ضربت قہر خدا لگی
کڑیاں کھلیں زرہ کی جب اُس کی ہوا لگی

برپا تھا شور چار طرف بھاگ بھاگ کا
پانی اثر دکھاتا تھا لوہے میں آگ کا

بڑھ بڑھ کے چل رہی تھی جو تلوار چار سو
کشتوں کے ڑھتے جاتے تھے انبار چار سو

تھا رن میں گرم موت کا بازار چار سو
پھرتا تھا جھوم جھوم کے رہوار چار سو

تیغ آئی جس پہ اُس کا بھی وار اُس پہ چل گیا
وہ سر گرا گئی تو یہ لاشہ کچل گیا

ہر اک علم کی چوب ضلالت نشاں کٹی
منہ تیغ کا کٹا تو سناں کی زباں کٹی

ترکش سے کٹ کے قلم ہوئے تیر سے سناں کٹی
ٹکڑے ہوئی زرہ کمر پہلواں کٹی

روحوں کے ساتھ تن تھے نہ روحیں تنوں کے ساتھ
تارِ نفس بھی کٹ گئے تھے گردنوں کے ساتھ

نار ہی صفوں میں چل گئے جب شعلہ زن ہوئی
چمکی اُدھر یہ تیغ تجلی اُدھر ہوئی

شب کو چمن کھلا جو سپر پتوں سے تر ہوئی
سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی

چلائی موت صدمے تری کج ادائی کے
بولی نکل سکے روح نثار اس لڑائی کے

جب سن سے فوج کفر پہ وہ جنگجو چلی
گویا سموم قہر خدا چار سو چلی
بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی
ٹکڑے اڑائے ذبح کیا خنجر دو چلی

غل تھا برش سے ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
ہم سمجھے ہیں فیصلہ یہ کرشمے قضا کے ہیں

جس کے گلے سے مل کے چلی مر کے رہ گیا
بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا

دو پتلیاں بھی پھر تماشا تلی رہیں
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

کہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جدا
ہر نخل قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا
اس ہاتھ سے جو تیغ تو اس سے سپر جدا
بھائی سے بھائی اور پسر سے پدر جدا

وہ ٹکڑے بھی ہول قیامت سے کم نہ تھے
کیا تفرقہ پڑا تھا کہ اعضا بہم نہ تھے

اسوار کو گرا کے سنبھلنے نہ دیتی تھی
لاکھوں میں ہاتھ ایک کا چلنے نہ دیتی تھی
برچھیت کو پرے سے نکلنے نہ دیتی تھی
رستم بھی ہو تو ہاتھ بدلنے نہ دیتی تھی

جو اس کا کام تھا سو وہ پھرتی کے ساتھ تھا
جس کا قدم بڑھا نہ سپر تھی نہ ہاتھ تھا

اٹھی چلی سپاہ میں آئی جدا ہوئی
پنجہ جو بچ گیا تو کلائی جدا ہوئی
صف کی جدا پرے کی صفائی جدا ہوئی
پیری جگر میں خوں میں نہائی جدا ہوئی

دم توڑتے یا مرے کوئی پروا ذرا نہ تھی
نکلی جو خوں میں بھر کے پھر آشنا نہ تھی

چھپتی تھی برق اُسکی چمک دیکھ دیکھ کے
رہ جاتی تھی سہا کو سمک دیکھ دیکھ کے
تھراتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے
خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے

جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کی جال کا
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

سب سے جدا تھی تیغ کے چلنے کی قطع و راہ
اس صف شکن کے ہاتھ پاؤں قلم وہ سر اشتباہ
خط جا بجا تھے خاک پہ مابین رزمگاہ
کٹ کٹ کے تیغیں کہتی تھیں اللہ کی پناہ

کتنا اسکے لو پھر آئی لہو چاٹتی ہوئی
چلتی ہے یہ تو راہ کو بھی کاٹتی ہوئی

حرؓ کی تلوار

کس صف پہ چلی تیغ کہ آفت نہ دکھائی
کس غول پہ چمکی کہ قیامت نہ دکھائی
کس کس کو پری بن کے شرارت نہ دکھائی
جلوہ کیا سو بار پہ صورت نہ دکھائی

پھل اُس کا نظر بندی اعدا پہ تلا تھا
اس میں کوئی پردہ نہیں مُنہ صاف کھلا تھا

بے سر نظر آیا وہ جسے پا گئی شمشیر
دم بھر میں لہو خاک پہ برسا گئی شمشیر
چمکی تو اُدھر اور اِدھر آگئی شمشیر
کیا مُنہ تھا کہ فولاد کو بھی کھا گئی شمشیر

سکتہ تھا ہر اک دل پہ عجب ضرب پڑی تھی
پرزے کیا اُس کو بھی زرہ لاکھ کڑی تھی

جو دشمن دیں تھا اُسے پہچانتی تھی وہ
مغفر کو حباب لب جو جانتی تھی وہ

چار آئینہ و خود کو کوکب مانتی تھی وہ
ہر وار میں جوشن کا جگر چھانتی تھی وہ

اژدر تھا کہ تلوار تھی دم تھا کہ ستم تھا
تابیں تھیں کہ گھر موت کا پانی تھا کہ سم تھا

بیحال عدو ہول کے مارے نظر آئے
جو گھاٹ پہ تھے گور کنارے نظر آئے
جب سن سے چلی صاف شرارے نظر آئے
جوہر کبھی چمکے تو ستارے نظر آئے

اُس تیغ کا پھل کھا کے عدو خونیں طپاں تھے
جب سامنے تیغ آگئی سب پھول خزاں تھے

گہ خلق کے نزدیک کبھی دل کے برابر
رن میں کوئی زخمی کوئی ساحل کے برابر
پانی میں اثر زہر ہلاہل کے برابر
بسمل بھی نظر آتا تھا بسمل کے برابر

سر پہ تھی وہ جب تک کہ عدو راہ عدم لے
کیا دخل جو بیدم سے لئے دم بھر کہیں دم لے

شمشیر حسینی

کھنچ آئیں صفیں کھینچ کے جو دم تیغ نے کھینچا
سب فوج کو مابین شکم تیغ نے کھینچا
سر کے جو قدم سوئے عدم تیغ نے کھینچا
ہر فرد کے چہرے پہ قلم تیغ نے کھینچا

غل تھا کہ یہ ستی ہوئی آتش نہیں دیکھی
یہ کاٹ یہ کس بل یہ کشاکش نہیں دیکھی

سر تن پہ کسی ظالم خودسر کے نہ چھوڑا
مغفر کو سلامت کسی افسر کے نہ چھوڑا
زندہ کسی جرار کو لشکر کے نہ چھوڑا
تھا کون سا کیت جسے دو کر کے نہ چھوڑا

مارا جسے دوزخ کو وہ راہی نظر آیا
چو رنگ سیاہی پہ سپاہی نظر آیا

ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتی تھی شمشیر
خود آئینۂ تن کو جلا دیتی تھی شمشیر
منہ ناریوں کے منہ سے ملا دیتی تھی شمشیر
پانی میں کف مار پلا دیتی تھی شمشیر
زہر اُس کا چڑھا جس پہ وہ بسمل نظر آیا
فولاد کا جوہر سم قاتل نظر آیا

لوہے کی سپر کاٹ کے دستانے میں پہنچی
دو کر کے سپر خود کے پیمانے میں پہنچی
غرض سر و گردن سے چلی شانے میں پہنچی
شانے سے بڑھی روح کے کاشانے میں پہنچی
مجروح جو بھاگے تھے اُدھر فوج عدو کے
جنگل کی طرف ڈونگڑے پڑتے تھے لہو کے

کاٹا اُسے جس تیغ سے میدان میں لڑی تیغ
ٹکڑے ہوا چار آئینہ جس کے وہ پڑی تیغ
بکتر میں نہ اُلجھی نہ چھپانہ پہ اڑی تیغ
زرہوں کو کیا چاک یہ تھی منہ کی کڑی تیغ
دو کر دی تھی وہ ہر کس و ناکس کو یہ کس تھا
اک ہاتھ میں فارس تھا نہ زیں تھا نہ فرس تھا

مشہور تھی وہ رشک پری قاف سے تا قاف
جوہر تھا جواہر کا کہ تھا زیور شفاف
سر سے گئی تا صدر شکم سے گئی تا ناف
پھر دیکھو تو لب خشک زباں پاک دہن صاف
ٹپکا جو لہو منہ سے شرارے نظر آئے
دریا سے گہر ابر سے تارے نظر آئے

کشتہ تھا ہر اک تیغ کے بیساختہ پن کا
عریاں تھی مگر ہوش نہ تھا کچھ سر و تن کا
گرتا تھا لہو چھوٹ کے نہ بہر کے چمن کا
الٹی ہوئی تھی رنگ ٹپکتا تھا بدن کا
سب جسم لہو کا تھا حرارت تھی غضب کی
کفار کو کچوکا تھا شرارت تھی غضب کی

علی اکبرؓ کی جنگ

تھم تھم کے یوں گیا صفِ اعدا پہ وہ دلیر — جاتا ہو دانوں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
غازی جو بھوک پیاس میں تھا زندگی سے سیر — کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں سروں کے ڈھیر
اک سیل زور و شور سے آئی گذر گئی
ثابت نہ یہ ہوا صفِ اول کدھر گئی

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی — چار آئینہ کٹا زرہ خیرہ سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی — سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی
رہوار بھی دو نیم میانِ مصاف تھا
ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں — چلے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں — جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چمکی گری اٹھی ادھر آئی ادھر گئی — خالی گئی پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی — ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

اللہ رے دو آبۂ تیغِ دو دم کا کاٹ — آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ
مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ — ہر دم تھی اس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ
سہمی کو چھوڑ بند سے کب مانتی تھی وہ

ہر استخواں کو مغز قلم جانتی تھی وہ

آئی جدھر پلیٹ کے صفوں کو بھپا گئی
ہر اک کڑی کو زم سمجھ کر چپا گئی
تن سے اڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
فولاد کی زرہ کو اشارہ میں کھا گئی

چار آئینہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا
ذکر اُس کا کیا ہے خود تو دشمن کا نوالہ تھا

یارا فرار کا تھا نہ صورت فرار کی
ردیں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی
پیدل کی موت تھی تو خرابی سوار کی
ٹکڑے تھے دو کے ہاتھ یہ گھائی تھی بہار کی

آگے بڑھے تو منہ وہیں کٹ جائے گیو کا
بجلی کی تھی کڑک کہ طمانچہ تھا دیو کا

زندہ کسی کو تیغ دو دم چھوڑتی نہ تھی
بے دم لئے گلا کوئی دم چھوڑتی نہ تھی
پیاسی یہ تھی کہ جسم میں دم چھوڑتی نہ تھی
بھاگیں کہاں کہ موت قدم چھوڑتی نہ تھی

خود دوڑ بے جو لڑتے تھے گھوڑے وہ کوداب کے
بیڑی قدم میں بن گئے حلقے رکاب کے

حضرت عباسؓ کی تلوار

سو سو ہوئے بے سر صف دشمن پہ جب آئی
اتنی تو صدا آئی کہ برق غضب آئی
مہل تھا نہیں بچنے کا اجل سب کی آئی
پر بیٹہ کھلا کب گئی اور سر پہ کب آئی

افتادہ تھے سینے سر جو پسے فوج لعیں کے
سطریں سی نظر آتی تھیں صفحے پہ زمیں کے

ترچھی جو لڑی زیر بغل فرق سے نکلی
یوں جا کے تن ظالم پہ زرق سے نکلی
منہ غرب کی جانب جو کیا شرق سے نکلی
العظمۃ للہ کی صدا برق سے نکلی

ہتیار گر کے پڑتے تھے ثابت قدموں کے
سمٹے ہوئے تھے ڈر سے پھریرے علموں کے

دکھلا کے گل زخم بدن سے نکل آئی
ہمراہ لیے روح کو تن سے نکل آئی
شمشیر خزاں تھی کہ چمن سے نکل آئی
نیچے جو پڑی سر پہ توسن سے نکل آئی

سرکش تھا تا بہ سینہ افلاک پہ سر تھا
جھپکی تھی ادھر آنکھ ادھر خاک پہ سر تھا

مغفر پہ ہوئی غرق تو سر کاٹ کے نکلی
شانے پہ گری تا بہ کمر کاٹ کے نکلی
روکا جو سپر پر تو سپر کاٹ کے نکلی
سینے میں در آئی تو جگر کاٹ کے نکلی

ہر ہاتھ میں گردش تھی نئی ڈھنگ نیا تھا
گھوڑے کی بھی ٹکری تھی پہ چورنگ نیا تھا

حضرت عباسؓ کا علم

غازی کی وہ شوکت وہ شکوہ علم نور
پرچم تھا کہ بکھرے ہوئے تھے موئے سر حور
کہتی تھی پھریری کہ انا الطور انا الطور
ہم پنجہ پنجے سے ہے کیا مہر کا مقدور

سب فوج ملائک کی نظر اس پہ لگی تھی
اوڑھے ہوئے اک سبز ردا حور کھڑی تھی

حضرت عباسؓ کی تلوار

خاک اڑ گئی اس صف کی جدھر سے چلی وہ
اسوار گرا تھا کہ توسن سے چلی وہ
خود و سر و رو کاٹ کے جوشن سے چلی وہ
دو کر کے زرہ سینۂ دشمن سے چلی وہ

تھی رن میں جیسے توسن چالاک سے نکلی

کھینچا تو چمکتی ہوئی بس خاک سے نکلی

کٹ جاتی تھے منہ دیکھ کے سب تیغ زن اسکا | قامت میں کجی چال میں وہ بانکپن اسکا
تاریک زمیں اور وہ تاباں بدن اُس کا | چلتی تھی سروں پہ یہ نیا تھا چلن اُس کا
بجلی کو بھی تڑپا دیا تھا جلوہ گری نے
ناب اُس کی نہ تھی مانگ نکالی تھی پری نے

غل تھا یہ کسی تیغ میں یہ چم خم نہیں دیکھا | بجلی کی تڑپ کا بھی یہ عالم نہیں دیکھا
لشکر کا لہو پی گئی یہ دم نہیں دیکھا | ایسا کسی ناگن میں کبھی سم نہیں دیکھا
ہے دور سے برچھی تو برابر سے چھری ہے
سچ کہتے ہیں تلوار کی بھی آنچ بری ہے

اک آفتِ نو لشکرِ سفاک پہ آئی | جس صف پہ گری تیغ وہ صف خاک پہ آئی
گہہ فرق پہ چمکی کبھی فتراک پہ آئی | دو ہو گیا جس ظالمِ ناپاک پہ آئی
ہر صف کا یہ احوال تھا اس تیغ دودم سے
جس طرح کوئی کاٹے دو سطروں کو قلم سے

سالم صفِ ہیجا میں کسی سر کو نہ چھوڑا | سر کیا ہے کہ سب دو کیے پیکر کو نہ چھوڑا
جوشن کو کمربند کو کمبستہ کو نہ چھوڑا | چار آئینہ کو ڈھال کو مغفر کو نہ چھوڑا
لوہے کے چبانے کی صدا بھا گئی اسکو
جس چیز پہ منہ ڈال دیا کھا گئی اسکو

ذوالفقار

وہ غیض وہ نعرہ وہ چمکتی ہوئی تلوار | گویا تھا مجسم غضبِ حضرتِ قہار
اتنا تو پکارے کہ خبردار خبردار | ڈھالیں نہ اٹھی تھیں کہ گری برق شرربار

گرمی سے ہوا میں شرر اڑتے نظر آئے
جو نکا تھا غضب کا کہ سر اڑتے نظر آئے

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق
یاں موج تو واں سیل جو یاں ابر تو واں برق
وہ برق کہ خود مانگتی تھی جس سے اماں برق
منہ زہر برش قہر بدن آگ زباں برق

سرکش تھا جو ناری یہ جلاتی تھی اسیکو
لو سے یہ جگر کرنی تھی تو کھاتی تھی اسیکو

اٹھ کر کبھی ٹھیری کبھی چمکی کبھی چمکی
سیدھی صفِ دشمن کو ملی راہ عدم کی
سر گر گئے گردن جدھر اس تیغ نے خم کی
سیفی تھی کہ گویا دمِ شمشیر پہ دم کی

دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیدادگروں کی
تھی مینہ کی طرح خاک پہ بوچھار سروں کی

اک ضرب میں ہاتھ اسکے اڑا ئے تو سر اس کا
دل اس کا دو پارا کیا کاٹا جگر اس کا
شاخیں کٹیں اس نخل ستم کی ثمر اس کا
دم ہو گیا آخر ادھر اس کا ادھر اس کا

تھی سم کی حرارت جو بدن اس کا بھرا تھا
افعی کی طرح پیٹ میں کیا زہر بھرا تھا

تھا دور تلک خون سے اس تیغ کا رن سرخ
چہرے تو سیہ کاروں کے تھے زرد بدن سرخ
پھولا ہوا تھا تیغ کا اک پھل سے چمن سرخ
تھی تیغ دو پیکر کی زباں سرخ دہن سرخ

سب لے وجہ نہ منہ لال تھا اس عربدہ جو کا
بیڑہ وہ اٹھائے ہوئے تھی خونِ عدو کا

مغفر سے جھلم کٹ گئی گردن میں در آئی
جوشن سے گزرنا تھا کہ بس تن میں در آئی
گردن سے سر کنا تھا کہ جوشن میں در آئی
تن سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی

بچتا کوئی کیا تیغِ قضا رنگ کے نیچے

اک برق غضب کوند گئی تیغ کے نیچے

قبضہ تھا کہ تھا چہرۂ پُر قہر قضا کا ۔ ناہیں تھیں کہ دھارا تھا وہ دریائے فنا کا
باڑھ ایسی کہ رُخ پھر گیا دریا کی گھٹا کا ۔ پشتہ وہ کہ پی جائے لہو اہل جفا کا
تیغے کی جگہ یا اسد اللہ لکھا تھا
جو حصہ میں نا سیف ید اللہ لکھا تھا

پھیری کبھی کہہ خوں میں نہا کر نکل آئی ۔ ٹھہری کبھی غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ موج میں جا کر نکل آئی ۔ منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی
کیا ڈر اُسے طوفاں کا جو چالاک ہو ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہو ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا ۔ پیرے پہ جیسے ناز تھا سر اُس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر نہ افعی میں یہ سم تھا ۔ یہ تیغ کی جو ہاتھی قد اس واسطے خم تھا
یہ اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

جب شعلۂ سرکش کی طرح فوج پہ لپکی ۔ ادھر نظر آ گئی بجلی سی تڑپ کی
تھرائے جگر آنکھ ستمگاروں کی جھپکی ۔ سر اڑ گئے اور خون کی اک بوند نہ ٹپکی
جب ہاتھ اٹھا چرخ پہ سر چڑھ گیا اُسکا
پی پی کے لہو اور بھی دم بڑھ گیا اُسکا

حُرؓ کی تلوار

حُر پہ یہ اشارہ کہ تیغ حُر ذی جاہ چلی ۔ آگے پہ سپر تھی تو بجلی سوئے جانگاہ چلی
کس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی ۔ گہہ ٹیڑھی گاہ پھری گاہ تھمی گاہ چلی

زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

پھونکے بجلی کو یہ اُس آگ کی ہے پرکالا
برچھیاں چل گئیں اُس پر جسے دیکھا بھالا
کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا
آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

اُس کے پانی میں کفِ مارِ سیہ گھولا ہے
اژدم ہے یا ملک الموت نے مُنہ کھولا ہے

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی
ہاتھ مُنہ صدر پہ دو گر گردن و سر کاٹ گئی
دیکھی تیغوں کی جو بہر باڑھ اُسی گھاٹ گئی

جس پہ جاتی تھی نہ بیجان کئے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی کہ لاکھ جگہ گرتی تھی

گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اُسکا
ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اُس کا
زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اُس کا
جو پڑا جنگ میں قصہ ہوا فیصل اُس کا

شور تھا دیکھئے کیونکر یہ بلا ٹلتی ہے
اس قدر جلد تو سیفی کبھی نہیں چلتی ہے

کثرتِ جوہر ذاتی سے وہ گو جال میں تھی
تھی چمک جاذ میں بجلی تو یہی چال میں تھی
پرتو چہرۂ صورتِ ماہی وہی ہر حال میں تھی
کبھی مغفر میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی

کبھی دم لینے کی مہلت تھی نہ بسمل کے لئے
تھی جگر کے لئے برچھی تو چھری دل کے لئے

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہِ عید
برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید
حُر کے ہاتھ آگئی تھی گلشنِ جنت کی کلید
جا بہ مُنہ کفر کے پرزے بھی ہوئے تقلید و برید

نہ بچا تار نفس حلق میں جینے کے لئے

چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لئے

کیے حملے کئی پیہم جو کمانداروں پر
چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سوفاروں پر
چل گئے تیر ملامت کے جفاکاروں پر
رخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پر

جل کے خرمن ہوا یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا
کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا

میر انیس کے رخش قلم کی جولانیاں

"تلوار کے بعد گھوڑے کو دیکھئے کہ میر انیس نے تعریف میں کیا کام کیا ہے اور ایک مضمون کو کتنی طرح سے باندھا ہے۔ جس سے شہیدان کربلا کے گھوڑے براق و رفرف سے بھی چار قدم آگے نکل گئے ہیں۔

گھوڑا

وہ شہسوار اور وہ سمند فلک نورد
بازار برق گرم روانی سے اس کی سرد
پائی کبھی صبا نے نہ جس کے قدم کی گرد
تھا چال میں پری تو چھلاوہ دم نبرد

اس کی سبک روی سے خجالت سحاب کو
دریا پہ جائے اور نہ خبر ہو حباب کو

گھوڑا

صرصر سے تیز تر تھا وہ اسپ خجستہ فر
پانی پہ تھا جو موج تو آتش میں تھا شرر
یکساں تھا اس کو صورت خورشید دشت و در
گیتی نورد و برق تگ و آسماں سفر

ٹاپوں سے سرکشوں کی صفیں پائمال کیں

زیں آفتاب تھا تو رکابیں ہلال تھیں

سطے کی جو راہِ بجسہ تو بہ سنے نکل گیا
آیا اُدھر سے گر تو اُدھر سے نکل گیا
مانند خیر شکوہ شہد سے نکل گیا
پتلی کی گرد پھر کے نظر سے نکل گیا

سرعت میں تھا ہرن تو عنا میں ہزبر تھا
پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

گھوڑا

فرمانے یہ گھوڑے کو جو رانوں میں دبایا
روباہوں کے انبوہ پہ اک شیر سا آیا
شبدیز نظر کیا کہ ہوا نے بھی نہ پایا
اللہ ری سرعت کہ ہرن ہو گیا سایا

غل تھا کبھی یوں آگ سے پارا نہیں اُڑتا
اس شان سے جنگل میں چکارا نہیں اُڑتا

کیجے جو خیال آنکھوں میں بجلی سی چمک جائے
ساتھ اُس کے خیالِ شعرا دوڑ کے تھک جائے
یوں فکر منجم بھی نہ بالائے فلک جائے
چتون وہ کہ شیر و نکی نگہ اُس سے جھپک جائے

شپہہ جو وہ کرتا تھا تو ہٹ جاتے تھے گھوڑے
ہر صف میں الف ہو کے پلٹ جاتے تھے گھوڑے

مشرق سے جو راکب اُسے ہاں کہہ کے اُڑائے
ہے سے الف ہاں ابھی یاں وصل نہ پائے
عقل حکما دنگ ہو سرعت وہ دکھائے
مغرب سے یہ خورشید فلک جا کے پھر آئے

دھوکا یہ پرواز کا ہے دامنِ زیں پر
طاؤس ہوا پر ہے تو بجلی ہے زمیں پر

ہیں صانع قدرت نے کفل سانچے میں ڈھالے
کہتے ہیں رکابوں کو جو ہیں دیکھنے والے
ہر پیار سے گردنیں عناں ہاتھوں کو ڈالے
ہیں دو مہ نو زین کے دامن کو سنبھالے

گردن پہ عجب حسن سے بال اسکے پڑی ہو
گویا کہ پری کھولے ہوئے بال کھڑی ہے

پیتا حد امکاں صفت عقل رسا جائیے
کہسار سے دریا کی طرف مثل صدا جائیے
بالائے فلک صورت شبدیز دعا جائیے
دریا پہ جو دوڑاؤ تو مانند ہوا جائیے

سیر اُس کی اگر چشم کو منظور نظر ہو
آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو

اڑجاتے ہیں رنگ رخ عاشق سی سبک خیز
ہوتی ہیں غزالوں کی طراروں سے کہیں تیز
کاکل وہ کہ زلف سر لیلیٰ سے دل آویز
آقا کے ارادہ کو سمجھتا تھا وہ مہمیز

جوں سایۂ آہو نہ قرار اُس کو کہیں تھا
راکب نے جدھر آنکھ سے دیکھا وہیں تھا

گھوڑا

ہلچل وہ اُن صفونکی وہ گھوڑیکی جست و خیز
صدقے گئے ایال پہ گیسوئے مشک بیز
تھا ترک تاز میں کہیں صرصر سے تند و تیز
گرد آوری میں ابر تو بجلی دم ستیز

ذرے قدم کے فیض سے سارے چمک گئے
جب پتلیاں اُٹھیں تو ستارے چمک گئے

جرأت میں رشک شیر تو ہیکل میں پیلتن
بجلی کسی جست کہ تو کہیں ابر قطرہ زن
پوئی سے کہ وقت کبک دری جست میں ہرن
بن بن کے آڑ جاتے ہیں طاؤس کا چلن

سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آنکھیں وہ جنکو دیکھ کے حیران ہو غزال
آہو کی جست شیر کی قوت پری کی چال
گردن وہ جسکی خم سے ہو سرنگوں ہلال
دل اُسکو دست و پائے حنائی سے پائمال

ہر نعلِ پا کا حسن یہ تھا اُس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

دیکھی نہیں کسی نے یہ نرمی شتاب میں
ہو جس کی زین صاف پہ مخمل بھی خواب میں
سرعت کا اسکی وصف لکھیں گر کتاب میں
سطریں رہیں بہ صورتِ موج اضطراب میں

اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر

کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبد دوار پھیر لو
نقطے کے گرد صورت پرکار پھیر لو

دوڑے بروئے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

طاؤس سا جدھر گیا دم کو چنور کئے
دم میں پرے سپاہ کے زیر و زبر کئے
کچلے کبھی بدن کبھی پامال سر کئے
کشتوں کو روند روند کے سم خوں میں تر کئے

میداں میں تھا کسی کو نہ یارا ستیز کا
عالم ہر ایک نعل میں تھا تیغ تیز کا

زیبا ہے گر کہیں شعرا باد پا اُسے
آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اُسے
طائر جناں کے جانتے ہیں سب ہوا اُسی
مہمیز و تازیانہ کی حاجت ہی کیا اُسے

فتراک گر ہوا سے کبھی اک ذری اڑی
یوں اڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پری اڑی

گھوڑا

تھا زینِ فرس رحل تو قرآں شہ والا
وہ تخت ہوا تھا تو سلیماں شہ والا

وہ دوش صبا بوسے گلستاں شہ والا
وہ برج شرف نیّر تاباں شہ والا

بو گل کی نسیم سحری لے کے چلی ہے
غل تھا کہ سلیماں کو پری لے کے چلی ہے

ضیغم کی جو تھی جست تو آہو کے طرارے
آنکھوں کو چراتے تھے خجالت سے چکارے
ہر نعل سے خم تھا مہ نو شرم کے مارے
اٹھتے تھے قدم جب تو چمکتے تھے ستارے

ہو رشک نہ کیونکر فلکِ ماہ جبیں کو
نقشِ سمِ توسن سے لگے چاند زمیں کو

عونؓ و محمدؓ کے گھوڑے

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے
پتلی ہیں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے
یاں تھے جو سبکسار تو وہ گرم عناں تھے
مچھلی تھے کبھی جا تو کہیں آب رواں تھے

ہو سکتی تھی مچھلی سے یہ پھرتی نہ ہرن سے
چھوٹے تھے ہوا سے کہ نکل جاتی تھی سن سے

سرعت وہ سمندوں کی وہ چھل بل وہ طرارے
چھپتے تھے پہاڑوں نہیں ہرن شرم کے مارے
سُم ایسے کہ قدموں پہ فلک بدر کو وارے
جب نعل کھلیں چار ہلال اور اتارے

اڑ جانے کو افلاک پہ طیار ہی تھے
کیلوں سے یہ ثابت ہو کہ سیارہ ہی تھے

رخش علی اکبرؓ

جب کوند کر سمند یہاں سے وہاں گیا
ثابت نہ کچھ ہوا کدھر آیا کہاں گیا
جھاڑیں جو تیلیاں تو نظر سے نہاں گیا
گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا

غل تھا وہ آگے دیکھ لو اس بادپا کے پاؤں
دیکھے نہوں زمانہ میں جس نے ہوا کے پاؤں

سرعت میں شرمسار نسیم سحر ہوئی
آنکھوں میں پھر گیا نہ مژہ کو خبر ہوئی
تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی
جب خاک اڑی ادھر تو دم اسکی جنور ہوئی

گھوڑا نہ کہئے تخت سلیماں روانہ تھا
اُس کے لئے تو جنبش رگ تازیانہ تھا

باریک جلد وہ کہ خجل تافتہ و حریر
مشکیں پرند آہوئے رم خوردہ شیرگیر
حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر
آتش مزاج بادیہ پیما فلک مسیر

یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اُس راہوار کے
جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

تلوار تھی جواہر تو گھوڑا بھی برق تھا
مثل عروس زیور خوبی میں غرق تھا
کچھ اُس میں اور اِس میں مطلق نہ فرق تھا
دوگام اُس کو فاصلۂ غرب و شرق تھا

پاکھر تھی موتیوں کی عرق جسم پاک پر
آئی تھی بادِ تند فرس بن کے خاک پر

رخش علی اکبرؓ

ہاں گ سلنے کی نہیں اسپ فلک سیر کو تاب
ہو ذرا گرم تو اڑ جائے مثال سیماب
ڈالے کاوے جو دریا میں بشکل گرداب
یہ سبک رو ہے کہ ٹوٹے نہ کبھی سم سے حباب

نہ زمیں زیرِ قدم غرب سے تا شرق رہے
رشک سے نعل در آتش ہی سدا برق رہے

امام علیہ السلام کا گھوڑا

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح
شمیم تشمیم کے نکہتِ چمن آتی ہے جس طرح
تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح
یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بیشک پری ہے یہ

آیا عجب شکوہ سے اسپِ قمر رکاب
تھامے تھی فتح زین کا دامن ظفر کا باب
چشمک زنی ہلال پہ کرتی تھی ہر رکاب
حلقہ تھا نور مہر کا یا جلوہ گر رکاب

فتراک تھے کہ کھولے ہوئے تھا عقاب پر
زیں پر تھا ابر پوش کہ ابر آفتاب پر

اختر خجل ہیں زین جو اسپِ نگار سے
ذروں نے چن لئے ہیں ستارے غبار سے
تھمتا تھا کب سوار فراست شعار سے
گردن میں ہاتھ باگ نے ڈالے ہیں پیار سے

نازاں ہیں خود رکاب کے پائے کو دیکھ کر
بل کر رہا ہے خاک پہ سائے کو دیکھ کر

قربان اس نگاہِ ضیغم شکار کے
پامال کر دے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شائستگی کو پوچھ لو دل سے سوار کے
چاہے تو ایک طفل چڑھے باگ اتار کے

رکھ دے قدم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا
پیارا فرس ہے راکبِ دوشِ رسول کا

چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال
کھیلیں شکار شیر پہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کہئے نہ بال حور نے بکھرا دیئے ہیں بال
پھرنے پہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال

رستے ہیں یاد گنبدِ نیلی رواق کے

دلدل کی تیزیاں ہیں طرارے براق کے

سینہ کشادہ تنگ کمر چست جوڑ بند — گردن میں خم ہلال کا اور اُس پہ سر بلند
جاندار برد بار عدو کش ظفر پسند — بجلی کسی جگہ کہیں آہو کہیں پرند
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

دونوں کنوتیاں جو بہم ہیں بشکل لا — سوچیں تو اہل بزم کہ مطلب ہے اسکا کیا
ہاں بے زباں ہے گو پہ یہ کہتا ہے برملا — آقا ہے میرا صاحب لاسیف ولافتا
افسوس اہل شام کو کچھ پیش و پس نہیں
آقا حسین علیہ السلام سا نہیں مجھ سا فرس نہیں

حر کا گھوڑا

گھوڑا وہ برق تھا کہ جو اکبر گسے وباے — افلاک پر سمند نظر کی طرح سے جائے
اُسکے قدم کی گرد کو صرصر کبھی نہ پائے — پیک خیال و وہم یہ سرعت کہاں سے لائے
جس غول پر گرا تو اڑا اس شکوہ سے
پرواز کبک کرتا ہے جس طرح کوہ سے

رخش عباس رضی اللہ عنہ

آیا سجا ہوا وہ براقِ سمند سیر — تھا خود فلک پہ اُڑنے کو طیار مثل طیر
ہوتا تھا اُس کو ڈر سے غزالوں کا حال غیر — الحق سپاہ شر اُسے روکے تو یہ بخیر
صرصر قدم کے گرد کو پاتی نہیں کبھی
ڈھونڈے بشر پری نظر آتی نہیں کبھی

وہ زیب و زین زین کی وہ ساز وہ پھبن — زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دلہن
چشم سیاہ دیدۂ آہو پہ طعنہ زن — سرعت یہ تھی کہ بھولے تھے چوکڑی ہرن

جادو تھا معجزہ تھا پری تھا طلسم تھا
پاکھر نہ تھی زرہ میں تہمتن کا جسم تھا

رکھا قدم رکاب میں حیدر کے لال نے   نعلین پا کو فخر سے چوما ہلال نے
بخشی جو صدر زین کو ضیا خوش جمال نے   دم کو جھنور کیا فرس بے مثال نے

کس ناز سے وہ رشک غزال ختن چلا
طاؤس تھا کہ سیر کو سوئے چمن چلا

خوشبو سے ارض پاک ریاض جناں بنی   گرد اڑ کے غازۂ رخ لیلیٰ وشاں بنی
جلوے سے راہ دشت بلا کہکشاں بنی   نقش سم فرس سے زمیں آسماں بنی

سم بدر تھے تو نعل بھی چاروں ہلال تھے
نقش سم فرس سے ہزاروں ہلال تھے

حر کا گھوڑا

رہوار کی وہ چال وہ تلوار کا چلنا   بھاگڑ وہ پیادوں کی صفوں کا وہ کچلنا
غصے میں وہ شبدیز کی آنکھوں کا ابلنا   کف منہ سے گرا کر وہ کنوتی کا بدلنا

مارا تھا قدم اس نے شجاعت کے چلن پر
یوں گھوڑے پہ جاتا تھا اسد جیسے ہرن پر

اڑنے میں سمجھتا تھا فرس دل کا اشارا   رہوار نے کچلا اسے حر نے جسے مارا
وہ جست وہ چھل بل وہ ڈپٹ اور وہ طرارا   ہر ڈگ میں نظر شوخ کی اڑنے میں چکارا

ایسا تو سبک رو فرس برق سفر ہو
پتلی پہ ہو پتلی تو نہ آنکھوں کو خبر ہو

حضرت عباس کا گھوڑا

کہہ کر یہ بات باگ اٹھائی سمند کی   صورت بدل گئی فرس سربلند کی

چھل بل ہرن کی تھی پری تھی زندگی
سرعت بلائیں لیتی تھی ہر جوڑ بند کی

بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا
جنگل میں یوں اڑا کہ چکارا تڑپ گیا

مرکب قدم زمیں پہ نہ رکھتا تھا ناز سے
بجلی کو خوف کیا ہے نشیب و فراز سے
چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے
اڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے

راکب وہ ہیں جو فخرِ دو عالم کے تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہے کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتھنی وہ اُبلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسوئے پری کے بال
وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ سم وہ چال
دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال

وہ قصرِ آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اسے دیتا براق تھا

وہ رشکِ صبا خاک پہ کس طرح رکھے گام
گھوڑا
ہو وے جو فلک سیر زمیں سے اسے کیا کام
خوش قامت و خوش رو و خوش آغاز خوش انجام
تھا نعل در آتش کہیں دم بھر تھا نہ آرام

دھرتا ہوا لاشوں پہ قدم جاتا تھا گھوڑا
دامانِ جراحت کی ہوا کھاتا تھا گھوڑا

نعل آئینہ رنگ ایسے کہ الماس بھی شرمائے
برہم ہو اگر شکل و رنگ اس میں نظر آئے
ہر دم جو گندھی چوٹیوں کا دام نہ الجھائے
فتراک سے پر کھولے ہوئے چرخ پہ اڑ جائے

ششدر رہوں فلک زمین جواہر کی چمک
سم رکھ دے ابھی جا کے سرِ شیرِ فلک پر

علی اکبر کا گھوڑا

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
گنڈے کو دیکھ کر مہ نو ہوئے سرنگوں

رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں ؛ غنچے بھی کچھ پڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں

قرباں ہزار جاں فرسِ بے نظیر پر
سوفار دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پر

وہ صاف صاف اُس کی کنوتی کمر کفل ؛ اللہ رے کشادگیِ سینہ و بغل
سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل ؛ پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل

راکب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لئے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند ؛ سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند ؛ نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند

گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مُڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال ؛ کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی سے قدم کے تلے نہال ؛ اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آ گیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا ؛ آیا عرق تو ابرِ گہربار بن گیا
گہہ قطب گاہ گنبدِ دوار بن گیا ؛ نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا

حیراں تھے اُسکی گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

گھوڑے کی تعریف

سمٹا جما اڑا اِدھر آیا اُدھر گیا ؛ چمکا پھرا اچھال دکھایا ٹھہر گیا

تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا
گھوڑوں کا نٹن بھی ٹاپ سے اسکی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
سا نچے میں تھوڑ ڈھلے ہوئی سب اسکے جوڑ بند
شم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا
اُتر اوہ برق بن کے پری ہو کے اڑ گیا

جرات میں رشک شیر تو ہیکل میں پیلتن
پوئی کی وقت کیک دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کی آنے جانے میں طاوس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں ہے زلفِ حور سے خوشبو ایال کی
دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی
غصہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن یراق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے
بن بن کی جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
وہ تنگ تھوتھنی کہ غنچہ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر

علی اکبرؓ کا گھوڑا

بجلی سا ہر اک سمت نکل جاتا تھا گھوڑا
تھا سایۂ زلفِ علی اکبرؓ اسکا کوڑا

سر کٹ کے گرا جسکا اُسے ٹاپ سے توڑا
ماتھے پہ لگے تیر پہ منہ اُس نے نہ موڑا

اڑتا ہوا یوں فوج کے انبوہ سے نکلا
معلوم ہوا کبک دری کوہ سے نکلا

یہ صف ہوئی پامال تو اُس صف میں در آیا
طاؤس خیال اُس سے نہ سرعت میں بر آیا
یاں سے جو گیا واں تو اُدھر سے اِدھر آیا
نظروں سے چھپا گاہ تو گاہے نظر آیا

اڑنے میں مہک گل کی تن صاف سے آئی
ہر غول میں غل تھا کہ پری قاف سے آئی

حر کا گھوڑا

سُن کے یہ بانگ جولی اسپ سبک تاز اُڑا
ڈر سے رنگ عمر شعبدہ پرواز اُڑا
کیا اُڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اُڑا
دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اُڑا

باغ زہرا میں نسیم سحری جاتی ہے
غل تھا دربار سلیماں میں پری جاتی ہے

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند
حشر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گرد سمند
کہتے تھے شرم سے وہ لیکے جو دوڑے تھے کمند
یہ چھلاوہ تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند

کیا سبک سوئے چمن باد بہاری پہنچی
ہم یہیں رہ گئے واں حر کی سواری پہنچی

گھوڑا

کل کی طرح اشارہ میں سو بار پھیر لو
بجلی سے ہے جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوہ میں شکل گنبد دوار پھیر لو
نقطہ کے گرد صورت پرکار پھیر لو

دوڑے بروئے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے

گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہے
بالا دوی میں اُسکو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر ہوا جو چلی فرسِ خوش قدم بڑھا
گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں علم بڑھا
جوں جوں وہ سوے دشت بڑھا اور دم بڑھا
رایت بڑھا کہ سرو ریاضِ ارم بڑھا

پھولوں کو لے کے بادِ بہاری پہنچ گئی
بستانِ کربلا میں سواری پہنچ گئی

ارزق اور فرزندانِ ارزق سے حضرت قاسمؑ کی جنگ

فردوسی نے شاہنامہ میں مبارزوں کے اندازِ جنگ کی لاثانی تصویریں کھینچی ہیں تیرو کمان۔ تیغ و سنان کے چلنے کی صورتیں دکھائی ہیں لیکن میر انیس نے اردو میں جو کمال کیا اُس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف ہے جو سیکڑوں جگہ نت نئی حالتوں سے اظہار کمال کر رہا ہے یہاں ارزق کے چاروں بیٹوں کی جنگ اور اُن کی جنگ کے بعد خود ارزق کی نسبت کسی طرح سے حربات جنگ کا اظہار کیا ہے میں اُن میں سے چند بند لکھتا ہوں پہلے ارزق کا بڑا بیٹا مقابل ہوا

نیزے کا ستمگار نے آتے ہی کیا وار
پھر گھوڑے کو چمکا کے جو آیا وہ جفا کار
قاسم اُسے رد کر کے پکارے کہ خبردار
بجلی سی ادھر سے بھی چلی تیغ شرر بار

رو کے کسے ظالم کبھی یاں تھی کبھی واں تھی
نیزے کو جو دیکھا تو نہ بوڑھی نہ سناں تھی

تلوار کا ظالم نے کیا وار جھپٹ کر
خالی دیا اُس وار کو تو شاہ نے ہٹ کر

دولھا نے جو حربہ کیا گھوڑے کو ڈپٹ کر
دستانے بھی ساعد بھی گرے تیغ سے کٹ کر

حیران تھے قوت پہ ملک ابنِ حسنؑ کی
اس زور سے پٹکا کہ زمیں ہل گئی رن کی

اُس کے بعد تین بیٹے اور حضرت قاسمؑ کے ہاتھ سے مارے گئے تب ازرق بڑے ہی جوش و خروش سے چنگھاڑتا ہوا نکلا اُس کی نسبت لکھتے ہیں

چاروں پسر ازرق کو نظر آئے جو بے دم
طاری ہوا غصہ نہ ملی فرصتِ ماتم
اک آگ عناصر میں بھڑکنے لگی اُس دم
باندھا کمر چُست کو زنجیر سے محکم

بیٹھے ہوئے سر پر جو نہ قتالِ عرب سے
آنکھیں ہوئیں دو کاسۂ خوں جوشِ غضب سے

آیا وہ ستمگار سجے اسلحہ تن پر
ترکش بھی دہن کھولے ہوئے صورتِ اژدر
شانے پہ کماں رخ پہ جھلم فرق پہ مغفر
بر میں تو زرہ اور کمر چست میں خنجر

کف غیظ سے مُنہ میں سخن سخت زباں پر
اک ہاتھ تو شمشیر پہ اور ایک عناں پر

نیزہ صفتِ مارِ زباں مُنہ سے نکالے
تلوار کا مُنہ ایسا کہ فولاد کو کھا لے
ترکش تھا کہ باہنی میں نظر آتے تھے کالے
ڈھال ایسی کہ جو کوہ کو دامن میں چھپا لے

گرز ایسا فلک خاک کا پیوند ہو جس سے
چار آئینہ وہ تیغ کا دم بند ہو جس سے

اور زیرِ زرہ پہنے تھا اس طرح کا بکتر
زنجیر سے باندھے تھا کمر یوں وہ ستمگر
خنجر نہ اثر جس پہ کرے اور نہ تبر
حلقے میں ہو جس طرح لیے کوہ کو اژدر

وہ رشکِ تہمتن تو فرس پیلِ دماں تھا
اسوار نہ تھا کوہ پہ اک کوہ رواں تھا

چنگھاڑ کے صف میں صفت دیو پکارا
قاسم نے صدا دی کہ یہ ہے کام ہمارا
کس شخص نے بیٹوں کو مرے جان سے مارا
الفت ہے جو بیٹوں کی تو ہو معرکہ آرا
ان بازوؤں میں زور ہے خالق کے ولی کا
تلوارزنی شاہی ہے میں پوتا ہوں علی کا

اس کے بعد چند باتیں ہو کر لڑائی شروع ہو گئی۔

پرکار سے میدان میں پھرنے لگے مرکب
بندھتا تھا کوئی بند نہ بنتا تھا کوئی ڈھب
رد کر دیا نوشاہ نے وار اس نے کیا جب
جرأت میں یداللہ یہ تھے اور وہ مرحب
اٹھتی تھی تتق گرد کی میدان بلا میں
چنگاریاں اڑتی تھیں سنانوں سے ہوا میں

نیزے تھے کہ دو مار نکالے تھے زبانیں
حملے تھے یہ شانوں سے نہ سر کی تھیں کمانیں
جن سے نہ بچیں رستم و سہراب کی جانیں
لڑ لڑ کے گریں خاک پہ نیزوں کی سنانیں
تھی زو جو کڑی ٹوٹ گئیں ڈانڈیں بھی لڑ کر
غصے سے مقابل ہوئے تیغوں کو پکڑ کر

بل کھا کے ستمگار نے غصے سے کہا ہاں
بولا یہ اٹھا تیغ کو وہ دشمن ایماں
قاسم نے کہا یہی گو ہے یہی میدان
لے وار ادھر روک تو لے کو وکب ناداں
تھی پاس سپر بھی پہ نہ اس وار کو روکا
نوشاہ نے تلوار پہ تلوار کو روکا

چمکا کے وہی تیغ جو دشمن کو بتائی
اک برق سی آنکھوں میں چمکتی نظر آئی
ہٹنے کی بھی مہلت نہ ستمگار نے پائی
ظالم نے سپر سر کے بچانے کو اٹھائی
احسنت کا غل فوج کے انبوہ سے اٹھا
معلوم ہوا ابر سیہ کوہ سے اٹھا

یاں مغفرِ دشمن پہ لگی تیغ سپر سے
بجلی سی چمک کر ادھر آئی جو ادھر سے
مغفر کو جو کاٹا تو بڑھی کاسۂ سر سے
گردن تھی جدا سینہ سے اور سینہ کمر سے

کیا ہاتھ جفا کار کو نوشاہ نے مارا
تھا شور کہ مرحب کو ید اللہ نے مارا

حضرت علی اکبر کی جنگ

تو لاشقی نے سنتے ہی یہ گرزِ گاؤ سر
آیا ادھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
اکبر نے دوشِ پاک سے لی ہاتھ میں سپر
دو ہو گیا عمود مثالِ غبار تر

گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ

کم تھے نہ یہ بھی زور میں گروہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا

رکھ کر سپر نیام سے لی تیغ شعلہ ور
بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
تھرا کے جواں نے صدا دی کہ الحذر
یہ بھی ادھر سے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر

جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کے زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجلا کے پھر کمند
کھولے تمام نیزۂ بیداد گر کے بند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند

گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
ترکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر
چلہ کٹا کماں کا زہے تیغ بے نظیر

قربان زورِ ضربتِ نصرت نشان کے
کھل کر قضا پہ بندہ گئے بازو کماں کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں
نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
سپر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی اُدھر سناں
بھالے کی نوک جھوک نئی تھی نئی کماں

سہما یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پہ
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

امام علیہ السلام کی جنگ

جب رن میں تیغ تول کے سلطانِ دیں بڑھے
گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانند شیر نر کہیں ٹھیرے کہیں بڑھے
گویا علیؓ کہ اُلٹے ہوئے آستیں بڑھے

جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
مشکلکشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسینؑ یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

اللہ ری تیزی و برش اس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلب گار جنگ کی
حاجت نہ سان کی تھی اُسے کچھ نہ سنگ کی
خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی
سو بار دم میں چرخ پہ چڑھتی اُترتی تھی

تیر افگنی کا جنکی ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا انکو سوائے گور
تاریک شب میں جنکا نشانہ تھا پائے مور
لشکر میں خوف جاں نے انہیں کر دیا تھا کور
ہوش اڑ گئے تھے فوج ضلالت نشان کے
پیکان زہ کو رکتے تھے سوفار جان کے

صف پہ صفیں پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار فرس پہ فرس گرے
اٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر پہ پیک پیک پہ مرغ عسس گرے
ٹوٹے پرے شکست وہ فوج ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی افتاد کم ہوئی

گھوڑوں کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی
سو سو صفیں کچل گئیں جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
آری جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ پھرا لئے تھے کارزار سے

میرانیس کی معجز بیانیوں کے مختلف نمونے

نیزوں کے وار

علی اکبر کی جنگ

نیزے ملے وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں
ہر طعن قہر کی تھی قیامت کی ہر نکاں
چنگاریاں اڑیں جو سناں سے لڑی سناں
دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئے زباں
پھیلے شرر پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

ان کا نہ ایک وار نہ اس کے ہزار بند
بڑھ بڑھ کے کھول دیتا تھا یہ شہسوار بند
کیا دنیزہ بازی میں تھا بار بار بند
چوٹوں سے نیلگوں تھے جفا جو کی چار بند
خالی گئی نہ فرق کی نے دست و پا کی چوٹ
کھلتی کبھی ہے بندھی ہوئی مشکلکشا کی چوٹ

ڈوبی گرہ میں نیزۂ ظالم کی جب سناں
گھوڑا اڑا کے ہاتھ کو اکبر نے دی نکال
اللہ رے زور اٹھ گیا گھوڑی سے پہلواں
دستِ شقی سے چھوٹ گئی ڈانڈ ناگہاں
نیزے کے ساتھ شور اٹھا اس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سیمرغ کوہ سے

میدان جنگ کی چوٹیں

مصروف جنگ تیغ سے تھے سرور حجاز
چمکا کے اسپ واں سے بڑھا ایک نیزہ باز

نامرد نے کیا جو ہیں دست ستم دراز
نیزہ اٹھا کے کہنے لگے شاہ سرفراز

ہاں اے اجل گرفتہ کمر استوار کر
نیزے کا ہے غرور تو آ کوئی وار کر

کس طنطنہ سے شاہ پہ آیا وہ ناپسند
کل کی طرح سے پھرنے لگا ہر طرف سمند
نیزے سے اسکے آپ کو پہنچا نہ کچھ گزند
مشکلکشا کے لعل نے کھولے تمام بند

تھا گو کہ نیزہ بازی پہ ظالم تلا ہوا
یاں تھا سبب اسکے عزم کا عقدہ کھلا ہوا

قربان زور بازوئے سلطان ارجمند
زیں سے اٹھا کے اس کو سناں پر کیا بلند
پہنچا سقر میں دار جہاں سے وہ خود پسند
پٹکا زمیں پہ جب تو ہوا چور بند بند

اپنے ہنر پہ ناز تھا اس نیزہ باز کو
دکھلا دیا جہاں کے نشیب و فراز کو

کام اس خطا شعار کا جب ہو گیا اخیر
نکلا پرے سے اک قدر انداز بے نظیر
بدکیش و کج نہاد و خطا پیشہ و شریر
چلے سے توڑ جاتا تھا جوشن کو جسکا تیر

کیا کوئی اس کے آگے بھلا سر اٹھا سکے
رستم بھی جس کماں کی نہ سیسر اٹھا سکے

قبضے میں تیغ لیکے پکارے شہ زماں
ہاں ناوک افگنی مجھے دکھلا تو اے جواں
ہاں نکلی منہ سے یاں کہ کھنچی اسطرف زباں
کھنچنا کماں کا تھا کہ چلا تیر بے اماں

حلقہ ادھر کماں کا خم ہو کے رہ گیا
یاں تیغ شہ سے تیر قلم ہو کے رہ گیا

خالی اسی روش سے ہوا ترکش شریر
تو دے لگا کے کاٹ کی حضرت نے سارے تیر
چلا تھا کشمکش میں کہ ہو جائے گوشہ گیر
چلائے شہ کہ بھاگ نہ او سرکشوں کے پیر

پیچھے ہٹے نہ پانوں مزا ہے یہ جنگ کا
تو بھی تو توڑ دیکھ دے میرے خدنگ کا

یاں دوش سے کماں کو اُتارا جناب نے
بیٹے کے ہاتھ چوم لیے بوتراب نے
قبضے میں ماہ نو کو کیا آفتاب نے
تا کا خطا کو تیز نگہ سے ثواب نے

ترکش بھی اژدہا سا دہن کھولنے لگا
نکلا عقاب تیر تو پر تولنے لگا

چلے میں تیر رکھ کے بڑھے قبلۂ امم
کچھ کہہ کے گوش شہ میں چلا تیر یکدم
اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم
آواز دی کماں نے زہے شاہ باکرم

چلہ تو دستِ شاہ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گرز و سنان و تیغ و تبر کانپنے لگے
ڈر سے کماں کشوں کے جگر کانپنے لگے
نیزے مثال شاخ شجر کانپنے لگے
گو ترکشوں میں تیر تھے پر کانپنے لگے

پیچھے ہٹے کھڑے تھے جو ظالم بڑھے ہوئے
گوشوں سے خود اُتر گئے چلے چڑھے ہوئے

دو دو چوٹیں

دو شخصوں نے اک غول سے رہوار نکالے
چار آئینہ بر میں سپر ایسا کہ نہ ہو نیزہ ڈالے
اک ہاتھ میں نیزہ لیے اک تیغ سنبھالے
امداد کو پہنچے کئی سو برچھیوں والے

کس دھوم سے وارد سر میداں ہوئے دونوں
پڑھ پڑھ کے رجز جنگ کے خواہاں ہوئے دونوں

برچھوں کو تلاتے ہوئے آئے جو وہ بدکار
ہر گشت میں پھرتے تھے فرس صورت پرکار

شبدیز کو چمکا کے پکارے شہ ابرار — آتی ہے اجل سر پہ خبردار خبردار
حافظ ہے خدا کچھ مجھے پروا نہیں جو ہو
یہ بھی ہے شگون نیک کہ پہلے ہی سے دو ہو

ناگاہ بڑھے تول کے نیزوں کو وہ خونریز — مہمیز جو کی برق مجسم ہوئے شبدیز
ٹاپوں سے ہلا دور تلک دشت بلا خیز — فولاد میں در آئیں سنانیں تھیں وہ سر تیز
آمد میں یہ دعوے تھا ہر اک بانی شر کو
نوکوں پہ اٹھا لیتے ہیں زہرا کے پسر کو

وار آپ نے جب بار دگر اُنکے کئی باری — تھرانے لگے ہاتھ یہ دہشت ہوئی طاری
تھی تیغ شہ دیں غضب حضرت باری — کانپا جو کلیجہ وہ دنی ہو گئے ناری
نیزوں کی سناں کو دم شمشیر نے کاٹا
غل تھا کہ سر شمع کو گلگیر نے کاٹا

اک ضرب میں دونوں کی جو نیزے ہوئے بیکار — تلواریں علم کر کے پھر آئے وہ ستمگار
تیغیں جو چپ و راس سے چلنے لگیں اکبار — روکے سپر حضرت حمزہ پہ وہ سب وار
دونوں کو ڈرایا کبھی شمشیر دو سر سے
پسپا ہوئے وہ خود تو بڑھے آپ ادھر سے

اک ضرب میں ہاتھ اسکا اڑا اور سپر اُسکی — دو تھا جو سر اُس کا تو جدا تھی کمر اُس کی
اُس کو خبر اس کی تھی نہ اس کو خبر اُس کی — کی موت نے دعوت ادھر اسکی اُدھر اُسکی
گرمی میں لڑے تشنۂ شہ دلگیر سے دولوں
ٹھنڈے ہوئے آب دم شمشیر سے دولوں

علی اکبرؓ کی جنگ

پڑھ کر رجز دلیر در آیا سپاہ میں
گویا جھپٹ کے شیر نر آیا سپاہ میں
ہل چل ہوئی جری جدھر آیا سپاہ میں
خیبر کا معرکہ نظر آیا سپاہ میں
بجلی خدا کے قہر کی تھی یا حسام تھی
پہلے ہی وار میں صفِ اول تمام تھی

دوزخ میں ناریوں کی پئے پیش دس گئے
پانچ اس طرف پہنچ نہ چکے تھے کہ دس گئے
آگے گئے سوار تو پیچھے فرس گئے
جب برق تیر کوند گئی سر برس گئے
چھایا تھا ابر ظلم سپہ بد صفات پر
غل تھا کہ اولے پڑتے ہیں کشتِ حیات پر

قبضہ ہر ایک تیغ سے ہر تن سے سر لیا
برچھی سے پھل تو زین فرس سے تبر لیا
ڈھالوں سے پھول لے گئی پھولوں سے زر لیا
اپنا خراج تیغ نے اُن سب سے بھر لیا
بہرِ حصول جزیہ جو وہ تیغ تل گئی
اک اک گرہ بندھی ہوئی ہزنے کی کھل گئی

ترکش وہ جنکو جانتے تھے سب اجل کا گھر
کاٹے ہوئے پڑے تھے وہ ریتی پہ سر بسر
ہر اک عقاب تیر کے ٹوٹے ہوئے تھے پر
طاقت نہ تھی کہ شاخ کماں تک کریں گزر
اس جنگ میں دہن کو نہ سوفار کھولے تھے
طائر ڈرے ہوئے تھے کہ منقار کھولے تھے

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف
ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف
پرکالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

جی سن سنا گئے وہ جدھر سن سے آ گئی
گویا سموم کوہ کے دامن سے آ گئی

جلتے ہوئے کباب کی بو تن سے آگئی
چسکی تو الاماں کی صدا رن سے آگئی

کچھ واں فقط نہ فوج ہی آفت رسیدہ تھی
خوں میں زمیں بھی صورت بسمل طپیدہ تھی

ثابت نہ تھے زمیں پہ کسی تیغ زن کے ہاتھ
سب تھک گئی مگر نہ تھکے صف شکن کے ہاتھ
اڑتا تھا سر جسے یہ لگاتے تھے تن کے ہاتھ
وہ معرکہ رہا اسی گل پیرہن کے ہاتھ

پہنچا تھا ہاتھ ہاتھ جو دست خدا کا زور
ہر ضرب میں دکھا دیا خیبر کشا کا زور

سر سے عدو کے خود جدا تن سے سر جدا
سینے سے پسلیاں تو شکم سے کمر جدا
شانوں سے ہاتھ ہاتھ سے تیغ و سپر جدا
گھٹنوں سے ہر دو پائے ضلالت اثر جدا

ٹکڑے تھے عضو قطع تھا جامہ حیات کا
عالم مرکبات میں تھا مفردات کا

علی اکبرؓ کا مبارز

جب خوب لڑ چکا شہ دیں کا سرور جاں
بدکار و بدسرشت و بد آئین و بدزباں
نکلا ادھر سے جنگ کو اک شام کا جواں
سرہنگ و جنگجو و سلح شور و پہلواں

نازاں تھا اپنے زور پہ خانہ خراب کو
رستم کو مانتا تھا نہ افراسیاب کو

افزوں تھا دیو سے بھی تن و توش نابکار
اسفندیار عصر و نمودار و نامدار
قوت میں عمرو عنتر و مرحب کا یادگار
شیر آئے سامنے تو کرے تیغ سے شکار

شورش مزاج میں تو ستم آب و گل میں تھا
نا آنکھ میں حیا تھی نہ رحم اسکے دل میں تھا

بار گناہ حاکم فاسق تھا خود سر
تھی روسیاہی اپسر سعد کی سپر
ذی جوشن شقی کا جو تھا نا خلف پسر
پہنے تھا اُس کے تن کی زرہ ہر بد گہر
ظاہر کماں سے سرکشی بد نہاد تھی
قبضے میں تیغ بدعت ابن زیاد تھی

حضرت علی اکبرؓ اور پہلوان شامی کی چوٹیں

شامی بڑھا اُدھر کو جو بھالا سنبھال کے
صفدر نے دی صدا کہ ذرا دیکھ بھال کے
مہمیز کی فرس کو جو کاوے پہ ڈال کے
رہوار شیر بن گیا آنکھیں نکال کے
سیماب ہو جو گرم تو پھر کیا قرار لے
نزدیک تھا شقی کو فرس سے اُتار لے

پیچھے ہٹا جھجک کے جو خونخوار کا سمند
آگے بڑھا حسینؑ کا فرزند ارجمند
دونوں طرف نیزوں میں نیزے ہوئے بلند
عقدے ہنر کے کھل گئے بند ھنے لگے جو بند
لہراتے تھے ہوا سے پھریرے کھلے ہوئے
دو اژدہے تھے جنگ کے اوپر تلے ہوئے

گہہ ڈوانڈ پر تھی ڈوانڈ سناں پر کبھی سناں
انیوں سے اَڑ رہے تھے شرارے کہ الاماں
ہر طعن تھی غضب کی تو آفت کی ہر بکاں
طاقت کا جائزہ تھا شجاعت کا امتحاں
یہ بھی عرق میں وہ بھی پسینے میں غرق تھا
پر زور ضرب میں حق و باطل کا فرق تھا

کرار کی بندھی ہوئی چوٹیں تھیں سب اُدھر
زخمی کبھی گلا تھا کبھی ہاتھ گاہ سر
ہشیار کر کے صید کو جھپٹا وہ شیر نر
نیزے سے کار تیغ لیا واہ رے ہنر
سر پر بھلا ہوئے ہیں سخی سے دنی کہیں

بوڑھی کہیں تھی ڈانڈ کہیں تھی انی کہیں

گرز گراں اٹھا کے بڑھا وہ سیہ دروں
چلتا ہے کوئی سامنے اعجاز کے فسوں
آنکھیں غضب سے سرخ ہوئیں مثل جام خوں
ہر ضرب میں خفیف ہوا خود وہ ذوفنوں
تھا ان کا ہاتھ فضل خدا سے علی کا ہاتھ
بے زخم کھائے ہو گیا جھوٹا شقی کا ہاتھ

ظالم نے گرز پھینک کے قبضے میں لی کماں
چھوڑا شقی نے تیر سہ پہلو کہ الاماں
آیا مثال سیل قوی ہیکل و دماں
تھا سر پہ تیغ تول کے شہزادۂ زماں
ضربت تھی یا کہ قہر خدائے قدیر تھا
گوشہ تھا نہ کماں تھی نہ چلہ نہ تیر تھا

تیغ پھیر کر چلا تھا کہ غازی نے دی صدا
کیوں سہمگیں سے ہے کھینچ کے تلوار منہ پہ آ
او کج نہاد و سرکش و بدکیش و بے حیا
میداں سے بھاگتا ہے یہ ہی تیسری خطا
تیغیں پکڑ کے جنگ و جدل پر تلے نہیں
ہم پر تو کچھ ابھی ترے جوہر کھلے نہیں

لی زردرو نے میاں سے شمشیر برق دم
لگّے سیاہ ابر سپر سے اٹھے بہم
دو بجلیاں چمک کے ہوئیں یک بیک علم
چالاکیاں دکھانے لگے اسپ خوش قدم
دونوں طرف ہوئی تگ و دو کارزار میں
یہ گرد اڑی کہ چھپ گیا گردوں غبار میں

چوٹیں ستم کی چلنے لگیں اور غضب کے وار
اس شان سے شقی پہ چلے تشنہ لب کے وار
کس کس ہنر سے رد کیے اس بد ادب کے وار
یاد آ گئے ہر اک کو امیر عرب کے وار
رخ زرد تھا ہراس سے اس ہرزہ گرد کا
یاں ٹھاٹھ تھا علیؓ ولی کی نبرد کا

شوکت وہی شکوہ وہی اور وہی جلال — تیور وہی حواس وہی اور وہی کمال
تیغ و سپر میں شبیر الٰہی کی چال ڈھال — دعویٰ نہ اس پہ کچھ نہ تکبر نہ قیل و قال
نقشہ دکھا دیا شہ دلدل سوار کا
جب حرب کی تو نام لیا کردگار کا

ڈھالوں کی پر پڑے ہو گئے پیہم رکے جو وار — بھرتا تھا اژدہے کی طرح دم سیاہ کار
دانتوں کو پیس پیس کے آتا تھا بار بار — لیکن نہ بڑھنے دیتا تھا حضرت کا یادگار
بڑھ بڑھ کے یوں وہ ہوتا تھا پسپا دلیر سے
جس طرح زخمی صید دبکتا ہے شیر سے

لایا کلام سخت جو لب پر وہ بد زباں — بس آگیا جلال میں شہزادۂ زماں
دستِ اجل بڑھا کہ اٹھی تیغ جانستاں — اڑ کر گیا فرس پہ سمند سبک عناں
گھبرا کے خود اجل کے شکنجے میں آگیا
عصفور شاہباز کے پنجے میں آگیا

نہ وہ تہمتنی تھی نہ وہ زور گیو کا — منہ پھر گیا طمانچہ ضیغم سے دیو کا
ظالم شکار بن گیا کیہاں خدیو کا — کافر وہ تھا تو ہاتھ بھی مارا اجنبیو کا
نکلی بغل سے تیغ عجب کر و فر کے ساتھ
اک ہاتھ تن کے ساتھ گرا ایک سر کے ساتھ

حضرت زینب کے بچوں کی جنگ

ان چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے — تھیں کہنیاں پہونچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے
مثل اپنے جائے تھے جو ہمشیل رسالے — تھے جائزہ ان سب کا یہی دیکھنے والے
ناز اپنے ہنر پہ تھا شجاعان عرب کو

نیزوں کو قلم کر کے نزار کیا سب کو

موت آئی اُدھر نیچے دونوں جدھر آئے | جب ہاتھ بڑھے پاؤں پلٹ کٹ کر سر آئے
گہ سینے تک آئی تو کبھی تا کمر آئے | خالی نہ پھرے جس پہ گئے خونیں بھر آئے

ہر نیچہ بجلی تھا ستمگاروں کے حق میں
ڈوبے ہوئے تھے دومہ نو خوں کی شفق میں

علی اکبرؓ کی جنگ

دہشت سے نگوں تھے علم لشکر بے پیر | تھا ہاتھ میں نیزوں کی کبھی رعشہ صفتِ پیر
منہ موڑ کے عاری ہوئی ہر شامی کی شمشیر | گوشوں میں کبھی نیزے تھے ترکش میں کبھی تیر

تیغیں کہیں ہنگام زد و کشت نہاں تھیں
ڈھالیں بھی سواروں کی پس پشت نہاں تھیں

پہنچی جو چمک کر کسی ظالم کی سپر تک | بجلی سی سپر سے گئی وہ کاسہ سر تک
اللہ ری صفائی نہ ہوئی اُس کو خبر تک | یہ سر سے گئی سینے پہ سینے سے کمر تک

کاٹی کمر اس طرح سے دو کر کے زرہ کو
جس طرح کوئی کھول دے ناخن سے گرہ کو

تمیم نام پہلوان

پہنے ہوئے چار آئینہ و جوشن و مغفر | اور کہنیوں تک ہاتھوں میں دستانے برابر
اسپ دو رکا پہ تنہ راں دیو سا پیکر | سہراب سے پر زور تو رستم سے قوی تر

ہونٹوں کو چباتا تھا یہ غصے میں بھرا تھا
پیچھے ستم آرا کے سواروں کا پرا تھا

پہلوان شقی

نکلا یہ سن کے غیظ میں اک پہلوان روم
گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم

سرہنگ و پرغرور و سیہ قلب و نحس و شوم
لنگر سے جس کے ہل گئی مقتل کی مرز و بوم

مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

چہرہ مہیب غیظ سے آنکھیں لہو کی جام
تھرائے سام خوف سے کانپے وہ حسام

موذی سیاہ بخت سیہ دل سیاہ فام
کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علیؑ کا نام

کندہ سقر کے قعر کا پتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

کیا ذکر خود کا سر و گردن کا کیا حساب
گویا تھا اک قرابہ معکوس پر شراب

سینے کے تھے کواڑ کہ خیبر کا بند باب
تنور گرم تھا شکم خانماں خراب

راتب شقی کا رزق سپاہ یزید کا
تھا بار بار نعرہ ہل من مزید کا

ٹکڑے سے کرے پہاڑ کو وہ گرز گاؤ سر
پہنے ہوئے زرہ پہ زرہ بر میں بد گہر

زنجیرہ آہنی سے کسے جنگ پر کمر
منہ پھیرے جس سے تیغ وہ فولاد کی سپر

دستانے دونوں دست تعدی پسند پر
پاکھر بھی آہنی تھی شقی کے سمند پر

فوجِ اشقیا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں
امڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں
ہلتا تھا دشت کیں دل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کی پرے شامیوں کے دل
خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہل نار و دغا باز و پر دغل
شہ کلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ سے تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ سے تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی ہے کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار
آگے بڑھے جلو سے نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
جانباز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
سب لوگ فکر قتل شہنشاہ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرز گاؤ سر
ضربت سے جن کے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا کھچی ہوئی ہیں کمندیں ادھر ادھر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر
سب لوگ جا بجا پئے قتل ستیز ہیں
تیغیں کھچی ہیں اپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

حالت جنگ

ناگاہ کوس حرب بجا فوج میں اُدھر
گرجا جو طبل رعد پکارا کہ الحذر
شور دہل سے آگئے جنبش میں دشت و در
قرنا کے غل نے کر دیا گوش سپہر کر
ڈھالوں کا ابر اٹھا کہ زمیں تیرہ ہو گئی
تیغوں کی بجلیوں سے نظر خیرہ ہو گئی

اک بار دس ہزار کمانیں ہوئیں جو زہ
نے تھی شکن جبیں پہ نہ ابرو پہ تھی گرہ
تیر آئے اس طرح کہ برستا ہے جیسے مینھ
تیروں سے غازیوں کی قبائیں ہوئیں زرہ
آنکھیں لڑی ہوئی تھیں صفِ فوجِ شام سے
تلواریں اگلی پڑتی تھیں اُن کی نیام سے

میدان رستخیز

نقارہ وغا پہ لگی چوب یک بیک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت و در تلک
شور دہل سے شور تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیٔ نبرد
تھا چرخ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد
گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے دہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخ لاجورد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اُڑے وحش و طیر کے

شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد — ہلتے تھے کوہ کانپتا تھا وادیٔ نبرد
تھا دن بھی زرد دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد — خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں

میدانِ جنگ کی صورت

گرتی تھی برق تیغ جو ہر پل ادھر اُدھر — سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل ادھر اُدھر
شبدیز تھا کہ پھر رہی تھی کل ادھر اُدھر — بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہل چل ادھر اُدھر
ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تھا الاماں کا شور پریشاں تھے اہل شر — تیغوں کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر — پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر
دانتوں میں خس ہراس سے تھے ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

ڈر کے کمانیں تیروں سے چلّے کماں سے دور — مرغانِ تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھی سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دور — پیروں سے عقل دور تہور جواں سے دور
تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں — چلّے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں — جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اُس کی چمک دمک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک
کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک

کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاو زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہ لعیں ہٹی
سہمے جبال نہر کنارے کہیں ہٹی
یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی

بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتئ گردوں پہ چڑھ گیا

نعرہ جدا صدائے تکبیر و بدہ جدا
بکتر جدا زمیں پہ ٹکڑے زرہ جدا
گوشے کماں سے دور تھے گوشوں سے زہ جدا
تیروں کو دیکھیئے تو گرہ سے گرہ جدا

اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس
بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
کڑیاں زرہ کی پاس نہ دامن سپر کے پاس

تیر ے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھا نہ چلہ کماں پر
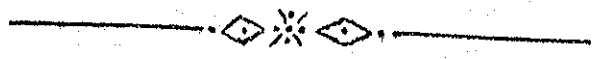
اشعار تعریف سراپا

سراپائے علی اکبرؓ

پیدا ہے زلف و روئے منور سے شانِ رب — نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطف عید اور شبِ قدر میں ہے کب — ہر دو طرف تو چین و خطا بیچ میں حلب

رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

پہلو میں دن کے رات زہے شانِ کارساز — یوسف جو دیکھ لے تو جھکائے سرِ نیاز
افزوں ہے سب سے رونقِ دینِ شہِ حجاز — زیبا ہیں گورے رُخ پہ غضب گیسوئے دراز

ایسا تو نظر پہ یہ شبِ معراج چڑھ گئی
حیرت سے ہے دن تو کم نہ ہوا رات بڑھ گئی

کیوں زلف کی ثنا میں الجھتے ہیں مُو شگاف — سلجھا ہوا بیاں ہو تو مضموں ہو صاف صاف
تعقید سر بسر ہے فصاحت کے برخلاف — باریک اس سخن کی ہیں راہیں خطا معاف

فکرِ رسا ہے جن کی یہاں وہ بھی ہیچ ہے
رستہ تو بال بھر کا ہے اور لاکھ پیچ ہے

وہ خود فرقِ پاک پہ وہ چاند سی جبیں — پرتو سے جس کے غیرتِ مہتاب سب زمیں
قسمت آں کی لوحِ مطلعِ نورِ آفتاب ہیں — آئینہ حلب یہ سبھنا مہ جبیں

اس کو جو اس جبیں کے برابر نہ دیکھتا
پھر اپنے آئینے کو سکندر نہ دیکھتا

ابرو ہے یا کھنچی ہوئی شمشیر تیز دم — صانع نے ایک لوح پہ رکھے ہیں دو قلم
پایا بھلا کمان کیانی نے کب یہ خم — کیا متصل ہے گوشہ سے گوشہ نہ ہے چشم

درستی کھنچے تو پھر کشش اُن کی بیان ہو
قربان ہو لاکھ بار تو خاطر نشان ہو

خمدار وہ بھویں وہ جبین قمر مثال — تابندہ ایک چاند کے نیچے ہیں دو ہلال
مطلع ہے صاف غور سے بینا کریں خیال — نقطہ ہے نور حسن کا ابرو پہ جو ہے خال

خوبی میں یہ تو یہ ہمہ تن لاجواب ہے
دیوان حسن میں یہی بیت انتخاب ہے

ہے آسمان حسن و شرف یہ فلک جناب — ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب
منظور شمسی و قمری کا ہو گر حساب — ہاں دیکھ لیں رخ خلف ابن بوتراب

باریک بیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
انتیس کا وہ چاند ہے یہ چاند تیس کا

مانند شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں — تو بھی مژہ کا وصف سر مو نہ ہو بیاں
قربان حسن صنعت خلاق انس و جاں — پردا ہے بہر چشم کبھی گاہ سائباں

موئے نگین در ثمین تخت یہ ہے
آنکھوں پہ جس کو رکھتے ہیں مردم شرف یہ ہے

اس چشم کو وہی کہے نرگس جو ہے بصیر — پیش نظر یہ دیدۂ حق بیں ہے بے نظیر
کیوں ہرزہ گرد ہو کے نگاہوں میں ہوں حقیر — یہ عین مردمی ہے کہ مردم ہیں گوشہ گیر

اس نور کے مکاں سے نکلنا فضول ہے
گھر بیٹھے ان کو سیر دو عالم حصول ہے

بیمار کہتے ہیں شعرا چشم کو جو سب — صحت میں اسکی شک ہو غلط ہو تو کیا عجب

دارالشفا یہ خود ہے پئے بندگانِ رب
دیدان کی ہر مریض کی صحت کا ہے سبب
چشمک سے ہے ان کو عیسیٰ گردوں پناہ سے
مردے جلا دیئے ہیں کرم کی نگاہ سے

آنکھیں وہ نرگسی جنہیں دیکھے سہی ہو سرو
یا صاف دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور
روشن میان کعبہ ہیں یہ دو چراغِ طور
کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغرِ بلور
حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں
ہشیار کیوں نہوں مئے عرفاں سے مست ہیں

جاگے ہیں رات کو تو نقاہت ہے آشکار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھپکتے ہیں بار بار
ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
آنسو ہیں یا صدف میں ہیں یہ درِ شاہوار
روتے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

رخسار کو قمر جو کہوں اُس میں داغ ہے
ذروں کو سر چڑھا ہے یہ کس کا دماغ ہے
خورشید ہے تو کیا ہے وہ دن کا چراغ ہے
وہ گل ہیں جنکے ذکر سے دل باغ باغ ہے
دنیا میں کوئی شے نہیں اس آب و تاب کی
رنگت ہے سیوتی کی تو خوشبو گلاب کی

آیا لبوں کا ذکر بس اب ناطقہ ہے بند
کیا لطف اگر مزا نہ اٹھائیں سخن پسند
ہے بے نمک یہ بات کہوں گر نبات و قند
خود مہرِ سخن سے اُنکی فصاحت ہے بہرہ مند
اعجاز ہے زبان بلاغت نظام میں
قرآں کی ساری شان ہے اُن کے کلام میں

مشکل ہے وصفِ گوہرِ دندانِ بے مثال
اس مدح میں صلہ کو جو ملنے کا ہے خیال
غواصِ بحرِ حسن دکھا آج کچھ کمال
بھر دیگا موتیوں سے دہن فاطمہ رض کا لال

قبضے میں آسماں کے خزانے زمیں کے گنج
ہنس ہنس کے یہ لٹاتے ہیں دُرِ ثمیں کے گنج

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکلکشا کا ہے ۔ زوران کلائیوں میں شہ لافتا کا ہے
گھر بازوں میں قوتِ خیبرکشا کا ہے ۔ سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہے

کیوں شور ہو نہ انکے قدم کے ثبات کا
جس سے تھما ہوا ہے سفینہ نجات کا

پڑتا ہے ماہ رُخ کا جو پرتو ادھر اُدھر ۔ پھرتی ہے چاندنی کی طرح ضو ادھر اُدھر
گرتے ہیں کانپ کانپ کے سو سو ادھر اُدھر ۔ لشکر میں ہے وغا ہے روا رد ادھر ادھر

دیکھو تو منصفو یہ ملک ہے بشر نہیں
چہرے پہ ضو یہ ہے کہ مجالِ نظر نہیں

علی اکبر کا سراپا

گیسوئے مسلسل رُخِ روشن پہ جو ہیں چار ۔ ہے ان سے عیاں سلسلۂ احمد مختار
یہ مصحفِ رخسار کی سطریں ہیں نمودار ۔ ہیں معنیِ پیچیدہ کھلے گر تو ہو طومار

زلفوں میں کرو غور ذرا رُخ کی ضیا کو
دیکھو شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو

چہرے کو اگر صبح کہیں زلف کو گر رات ۔ دن ہوتا ہے جب خلق سے کرتی ہے سفر رات
دنیا میں سدا شام سے ہوتا بہ سحر رات ۔ یاں بیچ میں خورشید ادھر رات اُدھر رات

گیسوئے رسا روئے دل افروز بہم ہیں
کیا قدرتِ حق ہے کہ شب و روز بہم ہیں

ابرو جو کمانیں ہیں تو مژگانِ سیہ تیر ۔ ہیں جنکے ہر اک گوشہ پہ قرباں دل شبیر

ہے دیدہ و ابرو سے عیاں جنگ کی تصویر　　دو مردم خونریز ہیں کھینچے ہوئے شمشیر
اب دیکھیں تو کون آنکھ ملا سکتا ہے رن میں
الٹیں گی صفیں فوج کی اک چشم زدن میں

پستہ ہے کہ غنچہ ہے دہن عقل ہے یاں گم　　لالے کی کلی میں نہیں دیکھا یہ تبسم
دانتوں کی چمک دیکھ سکے ہنگام تکلم　　اشکوں کی طرح آنکھ سے گر جاتے ہیں انجم
تابش میں جو دندان شکن برق ہوئے ہیں
دریائے خجالت میں گہر غرق ہوئے ہیں

بے مثل ہے یہ گردن و بازو و بر و دوش　　ساعد کی ضیا دیکھ کے موسیٰ کے اڑے ہوش
ہے ضو سے ہتھیلی کی قمر ابر میں روپوش　　یہ انگلیاں روشن ہیں کہ شمعیں ہوئیں خاموش
ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا
شرما کے مہ نو نے جھکایا ہے سر اپنا

سینہ ہے وہ سینہ کہ جو کینے سے بری ہے　　نور اس میں ہے یا آئینہ میں عکس پری ہے
کب قرص مہ و مہر میں یہ جلوہ گری ہے　　یاں روشنی طور چراغ سحری ہے
دیکھے جو اسے علم کے گنجینے کو دیکھے
اس سینے کو جو دیکھے تو آئینے کو دیکھے

بے مثل ہے سینے کی طرح یہ شکم صاف　　ہے صاف تو یہ بات کہ دشوار ہیں اوصاف
دیکھیں جو نظر بھر کے اسی صاحب انصاف　　خورشید سے روشن ہے تو آئینہ سے شفاف
ضو ایسی نہ آئینہ مہتاب میں دیکھی
مخمل نے یہ نرمی نہ کبھی خواب میں دیکھی

ہیں اسکے قدم راہ رو جادۂ تسلیم　　ہاتھ آئے ہیں کیا پانوں زہے عزت و تکریم
ان قدموں پہ جو سر ہو وہ ہے لائق تعظیم　　ثابت قدمی ان سے سدا پاتی ہے تعلیم

روشن جو ز میں سے ہے تو یہ پرتو ہے انہیں کا
جو راہ خدا میں ہے وہ پیرو ہے انہیں کا

بند سراپائے علی اکبرؑ

آنکھوں کو عین کعبہ سمجھتے ہیں حق پرست ۔۔۔ کیفیت رحیق محبت سے ہیں یہ مست
صانع نے کر دیا صفِ مژگاں کا بند و بست ۔۔۔ عین الکمال سے انہیں پہنچے نہ تا شکست

مردم میں روشنی ہے اسی نورِ عین سے
دیکھے کوئی ان آنکھوں کو چشم حسینؑ سے

گلزار حسن سے کوئی دیکھے دہن کا رنگ ۔۔۔ اُڑتا ہے غنچہ دہمن و یاسمن کا رنگ
شرمندہ ہے لبوں سے عقیق یمن کا رنگ ۔۔۔ رنگیں بیاں ہیں سب سے جدا ہے سخن کا رنگ

بلبل بھی مدح خواں چمن مرتضیٰ کی ہے
غنچے سے پھول جھڑتے ہیں قدرت خدا کی ہے

روشن ہے دشت گردن نازک کے نور سے ۔۔۔ فی الواقعی فزوں ہے ضیا شمع طور سے
موسیٰ دکھاتے ہیں ید بیضا کو دور سے ۔۔۔ شیشہ بھرا ہوا ہے شراب طہور سے

گردن بھی بے عدیل گلابی مثال ہے
تکمہ سہیل ہے تو گریباں ہلال ہے

سینہ خزینہ کرم و عدل و داد ہے ۔۔۔ ہاں لا کلام مصحف دین عباد ہے
جو رطب و یابس اس میں ہے سب انکو یاد ہے ۔۔۔ ایمان جانتا ہے جو خوش اعتقاد ہے

دولت جو نوح کی ہے سفینے میں ان کے ہے
جو طور پر ضیا تھی وہ سینے میں ان کے ہے

کس طرح کوئی وصف سراپا کرے رقم ۔۔۔ جلوہ خدا کے نور کا ہے سر سے تا قدم

قطرہ کہاں کہاں صفتِ قلزمِ کرم — چونٹی سے کیا ہو مدحِ سلیمانِ ذی حشم

یاں سب تعلّیاں شعرا کی فضول ہیں
بس خاتمہ ہوا کہ شبیہہ رسول ہیں

حضرت عباسؑ کا سراپا

جلتے رہیں کیوں کر نہ مہ و خور سحر و شام — ہے حسن کی آتش سے بھبوکا رُخِ گلفام
خال اور خطِ سبز وہ دانہ ہے تو یہ دام — ہے سب دلِ عالم کی اسیری کا سرانجام

بینی کو جو دیکھو تو عجب شوکت و شاں ہے
یہ حسن علمدار کے لشکر کا نشاں ہے

اک جا تو مناسب نہ تھے دو مردم بیمار — صانع نے اٹھا دی ہے فقط نور کی دیوار
اک شاخ سے یا دو گل بادام ہیں اظہار — یا یہ الفِ ماہ دو ہفتہ سے ہے نمودار

خوشبوئے گلستان ارم اس میں بھری ہے
گویا ورقِ زر پہ کلی گل کی دھری ہے

یاقوت لب سرخ ہیں دنداں دُرِ مکنوں — دیکھے سے عقیق یمنی کا بھی ہو دل خوں
کس چیز سے نسبت دہنِ تنگ کی میں دوں — نایاب ہے عنقا کی طرح طائرِ مضموں

حال ان کا نزاکت سے کھلے گا نہ کھلا ہے
یاں بابِ سخن بند ہی رکھیں تو بجا ہے

آتی ہے صدائے دُرِ دنداں جو زباں پر — تقریر کے رشتہ میں پروتا ہوں میں گوہر
ہیرے کی نگیں ان سے ہوں کس طرح برابر — یہ بحرِ شرافت کے ہیں موتی تو وہ پتھر

ہنسنے میں جو پڑ جاتا ہے عکس ان کا فلک پہ
بجلی بھی تڑپ جاتی ہے دانتوں کی چمک پہ

سراپائے قاسم کے بند

حیران تھا لشکر یہ ملک ہے کہ بشر ہے — گیسو ہے کہ ہالہ ہے جبیں ہے کہ قمر ہے
یہ ابروؤں کی بیت ہے یا حسن کا گھر ہے — پلکیں ہیں کہ سر پنجۂ شہباز نظر ہے

ہاں دیدۂ آہو بھی نگاہوں سے گرے ہیں
آنکھیں ہیں کہ دو شیر نیستاں میں کھڑے ہیں

فانوس میں ہے شمع کہ ہے رخت بدن میں — رخساروں پہ گیسو ہیں کہ ہے چاند گہن میں
ہر شخص کی آنکھوں کو چکا چوند ہے رن میں — سہرے میں یہ چہرہ ہے کہ سورج ہے کرن میں

تڑپے گا وہ تربت میں جگر بند ہے جسکا
کیا گزرے گی اس ماں پہ یہ فرزند ہے جسکا

غنچوں نے کہاں پائے لب ایسے دہن ایسا — باتوں میں مزا قند کا شیریں سخن ایسا
ہے عکس سے ملبوس گلابی بدن ایسا — غل تھا کہیں دیکھا نہیں گل پیرہن ایسا

اندازِ سراپا سے عجب لطف ملا ہے
جنت کا چمن سامنے آنکھوں کے کھلا ہے

آنکھیں وہ غزالان ختن جن پہ تصدق — رخسار وہ نازک کہ چمن جن پہ تصدق
لب ایسے کہ سو لعل یمن جن پہ تصدق — دانت ایسے کہ دُرہائے عدن جن پہ تصدق

دانتوں سے لڑا لے کوئی موتی کی لڑی کو
ہو جائیں گر یاقوت کے رنگ کوئی گھڑی کو

ہرچند کہ ملبوس میں مستور ہے سینہ — روشن صفتِ روشنیٔ طور ہے سینہ
ظاہر ہے کہ اک آئینۂ نور ہے سینہ — اللہ کے اسرار سے معمور ہے سینہ

نہ بدر میں یہ نور نہ یہ مہر میں ضو ہے

تکمہ تو ستارہ ہے گریباں مہ نو ہے

نعت سرور کائنات

فخر ملک و اشرفِ آدم ہے محمدؐ
حقا کہ خداوند دو عالم ہے محمدؐ

اکلیل سر عرش معظم ہے محمدؐ
آخر ہے مگر سب سے مقدم ہے محمدؐ

ایسا کوئی محرم نہیں اسرار احد کا
حال اُس سے ہی پوشیدہ ازل کا نہ ابد کا

اللہ نے دی تھی اُسے کونین کی شاہی
دی سنگ نے اُس شہ کی رسالت پہ گواہی

امی تھے پہ دل میں تھا سبھی راز الٰہی
اشجار بھی اعجاز سے اُس کے ہوئے راہی

دی مُردوں کو جاں سبز کیا خشک شجر کو
دو کر دیا انگلی کو اشارے سے قمر کو

بے سایہ جو مشہور وہ سلطان عرب ہے
ہے کون عدیل اُس کا کہ وہ سایۂ رب ہے

پیشِ عقلا وجہ یہ ہے اور یہ سبب ہے
دنیا میں کسی سایہ کا سایہ کہو کب ہے

ہے دوسری یہ وجہ کہ وہ جانِ جہاں تھا
بے سایہ کہ تھا جاں کی طرح سایہ کہاں تھا

پہلے کیا اللہ نے جس چیز کو پیدا
دس سو برس اُس دن سے وہ نورِ شہ والا

لکھا ہے کہ وہ نور جناب نبوی تھا
استادہ رہا روبروئے خالق یکتا

گہہ حمد و ثنا گہہ صفتِ قدرتِ حق تھی
اس نور پہ ہر دم نظرِ رحمتِ حق تھی

اُس نور سے فرماتا تھا یہ حضرتِ معبود
عزت کی قسم اپنی جو تو ہوتا نہ موجود

ہے خلق سے تو میری مراد اور مرا مقصود
تجھ بن ہی بستا عالم ایجاد کی نابود

پیدا کبھی کرتا نہ زمیں کو نہ فلک کو
دوزخ کو نہ جنت کو نہ آدم نہ ملک کو

اک بار یہ سنکر سخن خالق اکرم
سجدے کے لئے جھک گیا وہ نور مجسم
اونچا کیا سجدے سے سر پاک کو جس دم
پیشانی سے تب نور کے قطرے گرے پیہم
اُس نور کے قطروں سے پیمبر ہوئے پیدا
دریائے نبوت سے یہ گوہر ہوئے پیدا

تب کرسی و لوح و قلم و عرش و معلا
نجم و مہ و مہر و ملک و گنبد خضرا
شام و سحر و ظلمت و ضو جنت و دنیا
اللہ نے سب نور نبی سے کئے پیدا
حق یہ ہے کہ باعث ہو وہ عالم کی بنا کا
کیا رتبہ ہے کیا فیض ہے محبوب خدا کا

گرمی کا سفر

وہ کوس کڑے اور پہاڑوں کی وہ راہیں
یہ دھوپ میں شدت تھی کہ جلتی تھی زبانیں
دشوار تھا پانی کسی چشمے سے جو پائیں
اٹھتا تھا دھواں دل سے نکل جاتی تھیں آہیں
سونلا گئے تھے چاند سے مُنہ سیم بروں کے
ثابت تھا کہ خورشید برابر ہے سروں کے

مخفی تھے شرر شدت گرما سے حجر میں
جلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ گھر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں
پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے
ناری تھی ہوا سبز شجر زرد تھے سارے

ڈوبے تھے عرق میں اسد اللہ کے پیارے — دھڑکا تھا کہ یہ لوں کسی بچے کو نہ مارے

اللہ ری تپ و تابِ بیابانِ بلا کی
پھولوں کا عرق کھنچتا تھا گرمی سے ہوا کی

آفتاب کا نکلنا

پھاڑا جو گریباں شبِ آفت کی سحر نے — پردے میں چھپایا رخِ روشن کو قمر نے
پیمانہ خورشید لگا نور سے بھرنے — گردوں سے سفر فوجِ کواکب لگی کرنے

تاباں جو رخِ نیّرِ افلاک ہوا تھا
ذروں سے زرافشاں ورقِ خاک ہوا تھا

اظہار ہوئی خطِ شعاعی کی جو تنویر — روئے شبِ یلدا سے سیاہی ہوئی تغیر
خورشید نے کی سورۂ والشمس کی تفسیر — والفجر کی کرتا تھا تلاوت فلکِ پیر

پھیلا ہوا تھا نورِ سحر ارض و سما میں
مصروف تھی سب خلقِ خدا یادِ خدا میں

تمازتِ آفتاب

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوں کا وہ چلنا — وہ دوپہر اُس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا — اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیار کا جلنا

جنگل کے چرندے بھی چھپے بیٹھے پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے تشنہ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ کہ جس میں ہرن ہوتے ہیں کالے — اور ہانپتے ہیں شیر تر بانوں کو نکالے
گرمی سے دود دام میں منہ آبلے ڈالے — رہتی یہ دھوپ یاں تو پڑ جاتے ہیں چھالے

آہن کی بھی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

عالم غربت

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے
چھٹتا نہیں گر جان نکل جاتی ہے تن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام
کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی وہ غم و صدمہ و آلام
منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام
نیند آتی ہے کب لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

میدان جنگ کی گرمی

گھوڑوں سے گونجتا ہے وہ سب وادی نبرد
گردوں ہیں مثل شیشۂ ساعت بھری ہے گرد
ہے چرخ چارمیں پہ رخِ آفتاب زرد
ڈر ہے گرے نہ زمیں پہ یہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے وہ چند ہوگئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہوگئی

دستے وہ مصر و زنگ کے وہ فوج روم و شام
دن دوپہر وہ دشت کی گرمی وہ اژدحام
تیغیں برہنہ ہوگئیں تھیں چھوڑ کر نیام
مانند شمع جل رہی تھیں برچھیاں تمام
تلواریں منہ چھپائی تھیں سایہ میں ڈھال کے

خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

لوں چل رہی تھی رن میں کہ اللہ کی پناہ — ڈھالوں کے رنگ ہو گئے تھے دھوپ میں سیاہ
برچھی کے پھل پہ ہوتا تھا شعلے کا اشتباہ — گلشن بنی ہوئی تھی ہر اک آہنی کلاہ
گویا کہ قوس میں تھا گزر آفتاب کا
عالم تھا ہر خدنگ پہ تیر شہاب کا

گرمی کی شدت

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب وتب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سُرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

آب رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب وتب کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — کافور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے کرۂ زمہریر میں

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پہ تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

مسافرت

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
جاتی نہیں افسردگیِ خاطرِ ناشاد
ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر
جب ہو سفر خوف و پریشانیِ خاطر
منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر
شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے
رہ جائے پس قافلہ تنہا کر تو غضب ہے

دکھ دینے ہیں یکایک قدم پاؤں کی چھالے
منزل پہ پہنچنے کی بھی پڑ جاتی ہیں لالے

ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

وا منزلوں کے لینے کو کبھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی جو بیٹھے تو اٹھتا نہیں کوئی

رفقائے حسینی

وہ چاند سے ماتھے وہ قبائیں وہ عبائیں
تن پھول سے غنچوں کی طرح تنگ قبائیں
تسبیحیں تو ہاتھوں میں زبانوں پہ دعائیں
بس جادہ وہ سب راہ پہ جس راہ سے جائیں

نور مہ کامل کبھی سینے کو نہ پہونچے
بو ایسی کہ عطر ان کے پسینے کو نہ پہونچے

کس شان سے شملوں کے سرے دوش پہ چھوڑے
تیغیں بھی جو ریں تو کبھی منہ کو نہ موڑے
وہ رعب وہ اقبال وہ ہتیار وہ گھوڑے
ایک ایک جری شیر کے پیچھے کو مڑ ڈرے

برباد کریں کوہ کو ہاموں کو الٹ دیں
خیبر کی طرح قلعہ گردوں کو الٹ دیں

جاتے تھے سواری میں جلال و حشم آگے
جلدی تھی ہر اک کو کہ نکل جائیں ہم آگے
غل تھا کہ بڑھے جاؤ قدم با قدم آگے
پیچھے تو محمد کا نشاں تھا علم آگے

جنت سے کے پھر پھرتے ہوا آتی تھی رن میں
طوبا نے جگہ پائی تھی زہرا کے چمن میں

سفر کی تیاری

حاضر در دولت پہ ہیں سب یاور و انصار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار

ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں سے لئے فراش کھڑے ہیں

صبح کی سینری

طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشان صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھایا نقاب شب
در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حساب شب
دفتر کشائے صبح نے الٹی نقاب شب

گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطان غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

پہنچا جو مہر مہر سے فرمان عزل شب
گردوں پہ عاملان سحر کا ہوا نصب
منشی آسماں مع دفتر ہوا طلب
بس جا بجا سے اٹھ گئی انجم کی فوج سب

تا صبح فرد فرد میں یگانگی ہوئی
برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں
چن لی چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار پر گل مہتاب کی خزاں
مرجھا کے گر گئے ثمر و شاخ کہکشاں

دکھلائے طور باد سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یاد خدا میں زمزمہ پردازی طیور

وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور — خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخی شفق کی اُدھر چرخ پر بہار — وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشتِ کربلا کی زمیں رشکِ آسماں — تھا دور دور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذروں پہ تھا گماں — نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
سرسبز جو درخت تھا وہ نخلِ طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

دشتِ کربلا کی صبح

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا — مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا — وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
اُس دشت میں رونق تھی جو شبنم شہ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دمِ صبح کا وہ نور کا عالم — دلچسپ صدا نوبت دشمنا کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی اُفقِ چرخ پہ کم کم — وہ گل کے کٹوروں پہ دُر افشانی شبنم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالکِ گلزارِ جناں تشنہ دہاں تھا

خوفناک جنگل

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں — تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جائیں کہیں جانیں — روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

اندھیری رات

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی — ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغان ہوا ہیں طپاں بحر میں ماہی — تربت سے نکل آئے تھے محبوب الٰہی
کہتے تھے ملک رات نہ ہو گی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی نہ تھی تاریک شب ایسی

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہ والا — آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا — خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شیر خدا کے
تھا چیں بہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جاسوس کا خبر دینا

پہنچے نہ تھے امام ابھی تا بہ قتل گاہ — جاسوس نے یہ آ کے خبر دی میان راہ
قائم رہے شکوہ شہنشاہ دیں پناہ — آمادۂ نبرد ہے سب شام کی سپاہ
ناوک فگن کہیں ہیں کہیں نیزہ دار ہیں

میداں سے تا بہ نہر ہزاروں سوار ہیں

ذروں کی طرح فوج کا ممکن نہیں شمار — اس گھاٹ پر فقط ہیں کماندار دس ہزار
اُنسے اُدھر کو برچھیوں والوں کی ہے قطار — نیزے ہلا رہے ہیں سواران ہرزہ کار

پانی سپاہ شام سے پانا محال ہے
دریا تلک نگاہ کا جانا محال ہے

امام علیہ السلام کا خیمہ

وہ سر بلند خیمۂ زرنگاری امام — جس میں خدا کے عرش کے تاروں کا تھا مقام
کم تھا نہ اُس کا خانۂ کعبہ سے احترام — قدسی طواف کرنےکو آتے تھے صبح و شام

جلوہ تھا اُس میں برج امامت کے ماہ کا
درباں تھا جبرئیل اُسی بارگاہ کا

گیسوئے حور خلد کے ہمسر ہر اک طناب — دریا تھا وہ تو گنبد گردوں تھا اک حباب
وہ شان وہ شکوہ وہ رفعت وہ آب و تاب — شمسی سے جسکے آنکھ چراتا تھا آفتاب

پڑھنا درود آکے ملایک کا ورد تھا
سائے کے بدلے نور قناتوں کے گرد تھا

وہ اوج اور وہ قبۂ پر نور کی جھلک — ضو نور کی زمیں سے تھی آسماں تلک
دبدبے سے سر جھکاتا تھا چوبۂ فلک — اٹھ اٹھ کے دیکھتے تھے اُسے عرش سے ملک

خوشبو سے ہر بشر کا معطر دماغ تھا
وسعت سے اُس کی صحن کا دل باغ باغ تھا

تھا وہ سپہر دیں تو ہر اک چوب رکن دیں — چکر میں اسکے دور سے تھا چرخ ہفتمیں
تھا در پہ اُسکے گلشن فردوس کا یقیں — پردے سے تھے رشک پردۂ چشمان حور عیں

جلوہ سے حسن روئے شہ کائنات کے
آئینہ ہائے نور تھے ثقبے قنات کے

امام حسینؑ کی نماز جماعت

آراستہ صفیں تھیں کہ قرآں کھلا ہوا
اور مقتدی تھے سب عقب شاہ کربلا
بسم اللہ جیسے آگے ہو یوں تھا وہ مقتدی
مصحف کی جس طرح سے ہوں سطریں جدا جدا

جیسا امام ویسی ہی ابرار فوج تھی
ہر صف خدا کے نور کی دریا کی موج تھی

جوانان حسینی

اک اک دلیر شیر نیستانِ کارزار
دیندار سر فروش نمود ارنا مدار
رستم کی روح خوف سے جنکے کرے فرار
رانوں میں کوندتے ہوئے بجلی سے راہوار

للکاریں جو فوج کو نیزے سنبھال کے
بھاگیں عدو زمین پہ ہتھیار ڈال کے

اولاد کا ہونا

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاج دل مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی روح یہی روح یہی ہے

سطہ ثقبہ یعنی سوراخ ۱۲

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے — گل ہو کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے — آبادی کا شانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بد تر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہے وہ عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے — یہ ہے وہ نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہے جس سے — وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

صولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے — ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے — گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ قرم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے — تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے — ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرامِ جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے — وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لال ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے — وہ دُر ہے یہ در جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرام و جگر تاب و تواں ساتھ ہے اسکے
پھرتا ہے جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہے اسکے

عنایات ایزدی

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب
اس مسبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب

دے کسی شخص کو بندے میں مقدور ہے کب
وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب

اپنے کیسے سے نہ دام اور نہ درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

لاکھ ہاتھ اسکے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد
رزق وہ حوصلہ حرص سے دیتا ہے زیاد

ہم اسے بھولیں تو بھولیں اُسے ہر وقت ہے یاد
شکر معبود کا اس پر بھی نہیں کرتے عباد

وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اُس کا
کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اُس کا

جس قدر اُس سے طلب کیجئے خوشنود ہے وہ
ہاتھ پھیلائیے سو بار تو موجود ہے وہ

صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ
بخشش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ

پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے
یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

امام حسینؑ فرماتے ہیں

اب عمر بھی آخر ہے نمازیں بھی ہیں آخر
ہر وقت ہے رب دو جہاں حاضر و ناظر

بے توشہ پہنچتا نہیں منزل پہ مسافر
اجر اُن کا مضاعف ہے جو ہیں صابر و شاکر

مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو
بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو

نام اُس کا لئے ہے ورد سفر ہو کہ حضر ہو
موجود سمجھ لے اُسے جنگل ہو کہ گھر ہو

سجدے ہی کریں گے کہیں کہ راحت میں بسر ہو
تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو
عشق گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

چومے لب سوفار جو سینے پہ لگیں تیر
زخموں کو یہ سمجھے کہ ملا گلشن توقیر
دم عشق کا بھرتا رہے زیر دم شمشیر
تکبیر کا نعرہ ہو زباں پر دم تکبیر
کٹتے ہیں رگوں سے کہ صدا آہ کی نکلے
ہر رنگ میں بو الفت اللہ کی نکلے

امام حسینؑ گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں

یہ کہہ کے بڑھے سرور دیں جانب توسن
اسوار ہوئے آپ جو گرداں کے دامن
ہتھیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن
الدرّی ضیا خانۂ زیں ہو گیا روشن
وہ پاؤں رکابوں کے لئے باعث فخر تھے
خورشید کے قدموں کے تلے دو مہ نو تھے

امام حسینؑ کی سواری

میداں میں جب سواری شاہ امم چلی
فتح و ظفر ادب سے قدم با قدم چلی
کس شان سے جلو میں سپاہ حشم چلی
بدلی ہوا نسیم ریاض ارم چلی
سر تاج عرش تھا جو نگیں صدر زین پہ
قدسی پروں کو فرش کئے تھے زمین پہ

جوں جوں قدم بڑھاتا تھا سرور کا خوشخرام
تھا ارض کربلا سے معلیٰ کا یہ کلام
بنتے تھے نقش سم سے زمیں پر مہ تمام
گو فرش تھی پہ اب ہیں ہوئی عرش احتشام

ذروں کا اس زمیں سے فلک پر دماغ تھا
ہر سنگ ریزہ رشک دہ دشت وزاغ تھا

بچھی تھی ایک نور کی چادر جو دور دور
ہنستے تھے روئے مہر پہ ذرے نہیں تھا یہ نور
ہنستا تھا کہکشاں پہ یہ جادہ کو تھا غرور
ہر سنگریزہ کہتا تھا میں ہوں چراغ طور

تھا یہ زمیں کا قول کہ عنبر سرشت ہوں
کہتی تھی گرد نکہت باغ بہشت ہوں

وہ صبح اور وہ جلوۂ خورشید خاوری
وہ نور اور وہ شان جوانان حیدری
وہ صاف صاف آئینہ چرخ اخضری
راکب ہر اک ملک تھا تو مرکب ہر اک پری

صدقے سواری شہ گردوں رکاب کے
گویا ستارے جاتے تھے ساتھ آفتاب کے

موت

شکر خدا کہ موت نے دی مہلت اس برس
جو ذی حیات ہے اسے جینے کی ہے ہوس
اک دم میں ٹوٹ جاتا ہے یہ رشتۂ نفس
لیکن قضا سے کچھ نہیں چلتا کسی کا بس

چپکے چلے گئے ہیں زباں تک ہلی نہیں
ہم کیا پیمبروں کو تو مہلت ملی نہیں

فانی ہیں سب کسی کو نہ دیگی اجل اماں
چکھے گی آہ ذائقۂ موت ہر زباں
اس دم کھلے گا جسم سے نکلے گی جبکہ جاں
تھا گنج شائگاں کہ ہوا مفت رائگاں

لازم ہے قدر عمر کہ جنس خطیر ہے
جس کی بہا نہیں وہ دُر بے نظیر ہے

پھر کر نہ آئے گا وہ گزرتا ہے جو کہ دم
اس دم کی احتیاط مناسب ہے دمبدم

کہتا ہے دم قریب ہے اب منزل عدم
بڑھتا ہے سن مگر ہوی جاتی ہے عمر کم

انجام کار قبر کی منزل نظر میں ہے
ہم ہیں وطن میں عمر ہماری سفر میں ہے

جو شے کہ مستعار ہو کیا اُس کا اعتبار
ہے عمر بے وفا تو زمانہ ہے بے مدار
ہر گل یہاں خزاں ہے کبھی اور کبھی بہار
آنکھوں کے آگے اُٹھ گئے کیا کیا رفیق و یار

افسوس اس چمن میں وہ سرو رواں نہیں
ڈھونڈیں اُنہیں کہاں کہ قدم کا نشاں نہیں

حالت زمانہ

جو زندہ ہو قدر اسکی کسی کو نہیں زنہار
عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار
زندوں سے ہے کچھ ان مردہ پسندوں کو نہیں کار
سوجاتا ہے جب وہ تو یہ سب ہوتے ہیں بیدار

روئے تو اُسے کیا جو ثنا کی تو اُسے کیا
تعریف اگر بعد فنا کی تو اُسے کیا

گر زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے
یوں پیاس میں لا کر کوئی پانی نہ پلائے
اور وقت مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے
اور بعد فنا فاتحہ شربت پہ دلائے

پروا نہیں پیوند ہو گر رخت بدن میں
مرتے ہیں بس اسپر کہ تکلف ہو کفن میں

یوں ہاتھ نہ تھا میں جو گرے بندہ معبود
یوں جانتے ہیں قرض حسن دینے کو بیہودہ
تابوت کو دینا ہو جو کاندھا تو ہیں موجود
زر صرف ہو میت کے جو ماتم میں تو خوشنود

یوں بھول کے کبھی ذکر نہیں کرتے ہیں اُس کا
مرجاتا ہے جب کوئی تو دم بھرتے ہیں اُس کا

ہشیار ہو اے قوم کہ دنیا ہے گزرگاہ
کیا مرحلہ صعب ہے العظمۃ للہ
رہتا ہے گدا اس میں ہمیشہ نہ شہنشاہ
ٹھہراتے ہیں رہبر بھی وہ پر خوف ہے یہ راہ

اعمال و عقاید میں نہ ہرگز خلل آئے
کیا جانئے کس وقت پیام اجل آئے

کچھ وقت معین نہیں انساں کی اجل کا
بندہ وہ ہے پابند رہے نیک عمل کا
آج اٹھ گئے وہ کرتے تھے سامان جو کل کا
پلہ وہی بھاری ہے جو ہو جرم سے ہلکا

کیا خاک کا بوجھ اسکے لئے قبر میں کم ہے
ہو اور گناہوں کی گرانی تو ستم ہے

عجز و انکسار

خاموش زباں دعوئے بیجا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجت اظہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار
خود مشک ہو خوشبو تو نہ خوشبو کہے عطار

جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے سو نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انساں کے لئے عجز ہی لازم ہے بہر کیف
گر صاحب جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف
ہے خانہ دنیا میں ہر اک پیر و جواں ضیف
خارج ہو اصالت سے وہ ہستی نہیں جو سیف (مہمان ۱۲)

آفاق میں یوں فیض نگیں عام نہ ہوتا

ہوتا نہ فسردتن تو کبھی نام نہ ہوتا

بے نقط بند

وہ طاہر و اطہر ہوا گر معرکہ آرا
آگاہ ہو کس طرح کہ دشمن کو مارا
معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
صمصام کا اک وار ہو اسکو گوارا
واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوس ملک عدم ہو

سردار امم محرم اسرار محمدؐ
دلدار و دل آرام و مددگار محمدؐ
ہمدرد اسد اللہ کا دلدار محمدؐ
ممدوح ملک مالک سرکار محمدؐ
سرور کہو اسلام کا اس مالک کل کو
آرام دو اک دم دل سردار رسل کو

کس کا اسد اللہ سا ہو والد مرحوم
صدر دو سرا رحم دل و سرور معلوم
سلطان ہمہ مالک کل طاہر و معصوم
آسودہ ہو ہر سالک و گمراہ ہو محروم
معصوم کا دلدار ہو سالار امم ہو
اولاد کا اُس عالم و عادل کو الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اسطرح کا سردار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار
اس طرح کا عالم کا ممد و مددگار
وہ اصل اصول کرم داور دادار
حاصل اگر اک مرد دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اُس کو اسد اللہ کو مارا

اعلیحضرت نظام حیدرآباد کا میرزا اوج اور میر رشید کی مرثیہ خوانی کو سماعت فرمانا

لکھنؤ کے حکمراں شیعہ تھے اور میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی دھوم شہرۂ آفاق ہو چکی تھی لیکن میں نے نہیں سُنا کہ میر انیس یا مرزا دبیر کسی امیر و وزیر کی مجلس میں پڑھتے ہوں اور جانِعالم واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ بنفسِ نفیس اُس مجلس میں تشریف لے گئے ہوں۔ اور نہ میر انیس نے بادشاہ کے دربار میں باریابی کا خیال کیا کیونکہ خود اُنکے دربار کے لئے ساری دنیا باریابی کا موقع ڈھونڈتی رہتی تھی۔ البتہ مٹیابرج کلکتہ میں واجد علی شاہ نے مرزا دبیر کو یاد کیا۔ اور اُن کے کلام کی سماعت فرما کر اُن کے کمال کی داد دی۔ لیکن اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ نواب میر محبوب علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ و اقبالہٗ فرمانروائے حیدرآباد نے عشرۂ چہلم ماہ صفر ۱۳۲۴ھ میں بنفسِ نفیس نواب فیاض علی خاں بہادر کے امام باڑہ میں تشریف لے جا کر منبر کے سامنے بغیر سوزنی و مسند تکیہ سادہ طور پر نشست فرمائی اور جناب میرزا اوج خلف جناب میرزا دبیر مرحوم کی اعجاز بیانی کو دیر تک سماعت فرماتے رہے اور ختمِ محفل تک شریک رہے۔

یہ موقع میرزا اوج نے ایسا پایا جو اُنکے والد بزرگوار کو بھی حاصل نہ ہوا تھا اور جس سے زیادہ میرزا اوج کے لئے کوئی اوج نہیں ہو سکتا لیکن اس کے بعد جناب میر انیس کے خاندان میں کسی کو حضور والا کی سماعت کا فخر حاصل نہ ہوتا تو آپس میں ایک قسم کا چرچا کیا جاتا جس سے اس پارٹی کی دلشکنی متصور تھی لیکن اعلیحضرت نے

دوسری پارٹی کو بھی پورے طور سے اپنی عزت افزائی اور سخن شناسی کا موقع دیا اور حضور ممدوح بہ نفس نفیس نواب بہرام جنگ بہادر کے امام باڑہ میں تشریف لے گئے اور جناب رشید کی مرثیہ خوانی کو خوب دل لگا کر سنا۔ اور چونکہ خود اعلیٰ حضرت کو شاعری میں ملکۂ راسخہ حاصل ہے۔ اس لئے جا بجا جناب رشید کی سلاست و فصاحت کی داد دیتے رہے۔ حیدرآباد میں یہ پہلا موقع ہو کہ فرمانروائی ملک نے سبط شہید کی مجلس عزا میں شرکت کی ہو۔ نواب فیاض علی خاں بہادر اور نواب بہرام جنگ بہادر پہلے امیر سردار ہیں جن کو اس موقع پر اعلیحضرت کے خیر مقدم کا فخر حاصل ہوا۔

اسی طرح جناب میرزا اوج اور جناب میرزا رشید پہلے مرثیہ خواں ہیں جنکی اعجاز بیانیوں نے حیدرآباد جیسے مقام میں یہ اثر پیدا کیا کہ اعلیحضرت نظام حیدرآباد کے دل میں انکی گنجائش پیدا ہوگئی اور وہ انکے سننے کو بہ نفس نفیس تشریف شریف لا کر شریک مجلس عزا ہوئے جس نے حسینؑ مظلوم کی روح کو بے انتہا خوش کیا ہوگا اور جسکا ذکر تمام ملک میں تحسین و آفریں سے کیا جاتا ہے اور کیا جائیگا خداوند عالم اعلیحضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ و اقبالہٗ کے عمر و اقبال میں ترقی فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

حضرت اوج کو اعلیحضرت نے پانچ کشتیاں آموں اور خربزوں کی بھیجی تھیں اس پر فی البدیہ کو ایک رباعی تصنیف کر کے بطور شکریہ بارگاہ خسروی میں ارسال کی وہ رباعی یہ ہے۔

رباعی

اوج کو اوج ملا پرورش آصف سے	کشتی نور میں ہر خربزہ خورشید بنا
انبہ تازہ و تر دیکھ کے دل سینے میں	بول اٹھا انبتک اللہ نباتا حسنا

نقلیات

نقل شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے مشاعرہ میں یہ طرح ہوئی۔

روح القدس سے نام مرے ہمصفیر کا

دونوں استادوں کی معرکۃ الآرا غزلیں ان کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ ناسخ کی غزل کو زیادہ شہرت ہوئی اور یہ مطلع زبان زد خاص و عام ہوگیا ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیرؑ کا — روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

میر صاحب کی ابتدائے مشق تھی۔ غزل کہنے سے طبیعت کو روک لیا گیا تھا اس لئے اسی زمین میں سلام کہا اور نواب شرف الدولہ بہادر کی مجلس میں پڑھا جہاں اس سے پہلے وہ مشاعرہ ہوچکا تھا۔ سننے والے ایک ایک مصرع کو لے اڑے۔ اور جا بجا میر صاحب کے سلام کی دھوم ہوگئی۔ راقم نے سلام کے چند اشعار متن کتاب میں اور الحق جب ناسخ اور آتش کی غزلوں کے سامنے اس سلام کو دیکھا جائے تو میر صاحب کے کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر صاحب کے کئی مطلعوں میں سے ایک مطلع یہ ہے ؎

حافظ اگر ہو عدل جناب امیرؑ کا — کرتے ہیں سے جسم میں شعلہ حریر کا

نقل۔ میر قربان علی سالک (شاگرد میرزا غالب) اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت لکھتے ہیں۔

میں دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں۔ دلی میں میرزا غالب اور استاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور میرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ ایک طرف کا معتقد دوسری

طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر۔ میں نے اپنے آپ کو میر انہیں کے طرف داروں میں رکھا ہے۔ ایک روز میر صاحب سے دلّی کا ذکر آگیا۔ طرز بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تک اُن کے دل میں دلّی بسی ہوئی ہے۔ اپنی جائے سکونت (سبزی منڈی) کو فرمانے لگے۔ یہ اسی باغ کا سبزہ زار ہے۔ مرزا غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے یاد کیا۔ اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا۔ کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا ؎

ڈر کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چُپ سی لگ گئی۔ جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اُس کی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب اُس کو دیکھ دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ میں نے میرزا غالب کی یہ غزل پڑھی ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ۔۔۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر ۔۔۔ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اُس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا ۔۔۔ ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے یہ کہکر فرمانے لگے لکھنؤ والے رو کے سُنو۔

کھینچے ہے نہیں بولتے اور اُردو یا بھی اُن کی زبان پر نہیں مگر میں لکھ جاتا ہوں۔

نقل۔ جناب عشق سے اور جناب میر صاحب سے قرابت قریبہ تھی۔ اتفاق سے کچھ بے لطفی ہوگئی اور طرفین کی بیگمات نے اور بات بڑھا دی۔ ایک روز جناب عشق کا ذکر آیا جبکہ میر صاحب برافروختہ ہو رہے تھے لیکن اُس وقت میں بھی میر صاحب نے لطف بیان پر قابو رکھا۔ فرمایا کہ میں عشق کو خوب جانتا ہوں اُن کو پہلے ایک بات نکالنا پھر رونا دھونا خوب آتا ہے۔

عشق سے ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اُس کی اک نئی ہی چال
کہیں آنسو کی یہ روایت ہے کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

میر صاحب نے یہ شعر اس موقع پر پڑھے گویا میر تقی میر نے اسی موقع کے لئے تصنیف کئے تھے۔

نقل۔ میرزا دبیر کا ایک بے نقط مرثیہ مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا طاؤس کلک مدح اُڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلع مہر ہما ہوا اور روح کلام سر اسر ہرا ہوا

ہوگا عطارد اسم معرا ہمارا عام
کس کس کا اس طرح کا مسلّم ہوا کلام

ایک صاحب نے میر انیس سے ذکر کیا کہ میرزا دبیر نے ایک مرثیہ لکھا ہے جس میں اول سے آخر تک کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا۔ میر صاحب مسکرا کر بولے یہ کہئے سر سے پانوں تک دُمل ہے۔ جو لوگ جانتے تھے کہ اس صنعت کو صنعت مہملہ کہتے ہیں وہ میر صاحب کے لطف بیان سے محظوظ ہوئے لیکن راقم نے جناب آغا محمد صاحب وکیل جوڈیشل لکھنؤ سے سنا ہے کہ یہ مرثیہ میرزا دبیر کا نہیں بلکہ آغا صاحب کے

خاندان میں کسی کے زور طبع کا نتیجہ ہی جو اختر تخلص فرماتے تھے اور اختر کی رعایت سے اس مرثیہ میں عطارد تخلص رکھا مجھ کو آغا صاحب کا بتلایا ہوا نام بھول گیا شاید مرزا مہدی نام بتایا تھا

نقل میر انیس اپنے فرزند میر خورشید علی صاحب نفیس سے کچھ ناراض ہو گئے تھے اور وہ ناراضی اس درجہ پہنچ گئی تھی جس سے دونوں میں سخت کبیدگی تھی اور میر نفیس کی دوسری والدہ اُن کی طرف سے میر انیس کو بھڑکاتی رہتی تھیں اس لئے میر صاحب کو میر نفیس کی طرف سے بالکل بے پروائی تھی۔ ایک روز ایک صاحب نے باپ بیٹوں میں صلح کرانے کے لئے یہ تمہید پیدا کی کہ میر نفیس کا ایک مرثیہ سُن کر میر صاحب سے ذکر کیا کہ ایک صاحب نے مرثیہ لکھا ہے جو بالکل آپ کے کلام سے ملتا جلتا ہے۔ میر صاحب یہ سُن کر چونک پڑے اور فرمایا میں اُس مرثیہ کو دیکھ سکتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کل حاضر کروں گا۔ دوسرے روز وہ مرثیہ لے گئے۔ میر صاحب نے اول سے آخر تک اُس کو تعجب سے دیکھا اور فرمایا کہ بیشک یہ میرے خاندان کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور ترکیب کلام بھی مجھ سے ملتی ہوئی ہے۔ شاید میر مونس کی تازہ تصنیف ہے۔ اُن صاحب نے کہا نہیں۔ جب میر صاحب نے زیادہ اصرار سے پوچھا تو کہدیا کہ یہ آپکے صاحبزادہ گرامی میر نفیس کی تصنیف ہے یہ سُن کر میر صاحب نے وہ مرثیہ پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اور محبت پدری میں جوش میں فرمایا کہ میر نفیس کو بلالاؤ۔ چنانچہ میر نفیس حاضر ہوئے اور میر صاحب کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ میر صاحب نے گلے لگایا اور ہونہار فرزند کے زور طبیعت کی داد دی اُسکے بعد میر نفیس کو اپنا صحیح جانشین بناکر چھوڑا۔ میر نفیس کا درجہ شاعری میر انیس سے کم نہیں۔

نقل۔ میر مونس۔ میر نفیس میر انیس کے سامنے حاضر تھے۔ دوسرے خوش فکروں میں سے ایک صاحب نے کہا کہ آپکے خاندان میں سب صاحبوں نے اپنے اپنے مذاق کے موافق مرثیے لکھے ہیں اگر ایک مضمون پر ایک بحر میں تین مرثیے لکھے جائیں

ہشیار ہو اے قوم کہ دنیا ہے گزرگاہ — رہتا ہے گدا اس میں ہمیشہ نہ شہنشاہ
کیا مرحلہ صعب ہے العظمۃ للہ — تھراتے ہیں یاں رہبر بھی وہ پر خوف ہے یہ راہ

اعمال و عقائد میں نہ ہرگز خلل آئے
کیا جانیے کس وقت پیام اجل آئے

کچھ وقت معین نہیں انساں کی اجل کا — آج اٹھ گئے وہ کرتے تھے سامان جو کل کا
بندہ وہ ہے پابند رہے نیک عمل کا — پلہ وہی بھاری ہے جو ہو جرم سے ہلکا

کیا خاک کا بوجھ اسکے لئے قبر میں کم ہے
ہو اور گناہوں کی گرانی تو ستم ہے

عجز و انکسار

خاموش زباں دعوئے بیجا نہیں اچھا — ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا — آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار — پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجت اظہار — خود مشک ہو خوشبو تو نہ خوشبو کہے عطار

جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے سو نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انساں کے لئے عجز ہی لازم ہے بہر کیف — ہے خانہ دنیا میں ہر اک پیر و جواں ضیف
گر صاحب جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف — خارج ہے اصالت سے وہ کستی نہیں جو سیف

مہمان ۱۲

آفاق میں یوں فیض نگیں عام نہ ہوتا

ہوتا نہ فسروتن تو کبھی نام نہ ہوتا

بے نقط بند

وہ طاہر و اطہر ہوا گر معرکہ آرا — معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا اسکو گوارا
والله گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوس ملک عدم ہو

سردار امم محرم اسرار محمدؐ — مہر و اسد اللہ کا دلدار محمدؐ
دلدار و دل آرام و مددگار محمدؐ — ممدوح ملک مالک سرکار محمدؐ
سرور کہو اسلام کا اس مالک کل کو
آرام دو اک دم دل سردار رسل کو

کس کا اسد اللہ سا ہو والد مرحوم — حلال ہمہ مالک کل طاہر و معصوم
مصدر و سرار حم دل و سرور معلوم — آسودہ ہو ہر سالک و گمراہ ہو محروم
معصوم کا دلدار ہو سالار امم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کو الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار — اس طرح کا عالم کا ممد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار — وہ اصل اصول کرم داور دادار
حاصل اگر اک مرد دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسد اللہ کو مارا

اعلیحضرت نظام حیدر آباد کا میرزا اوج اور میر رشید کی مرثیہ خوانی کو سماعت فرمانا

لکھنؤ کے حکمراں شیعہ تھے اور میر انیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی دھوم شہرۂ آفاق ہو چکی تھی لیکن ہیں سنے نہیں سنا کہ میر انیس یا مرزا دبیر کسی امیر و وزیر کی مجلس میں پڑھتے ہوں اور جانعالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ بنفس نفیس اُس مجلس میں تشریف لے گئے ہوں۔ اور نہ میر انیس نے بادشاہ کے دربار میں باریابی کا خیال کیا کیونکہ خود اُنکے دربار کے لئے ساری دنیا باریابی کا موقع ڈھونڈتی رہتی تھی۔ البتہ مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ نے مرزا دبیر کو یاد کیا۔ اور اُن کے کلام کی سماعت فرما کر اُن کے کمال کی داد دی لیکن اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ نواب میر محبوب علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ و اقبالہٗ فرمانروائے حیدر آباد نے عشرۂ چہلم ماہ صفر ۱۳۲۴ھ میں بنفس نفیس نواب فیاض علی خاں بہادر کے امام باڑہ میں تشریف لے جاکر منبر کے سامنے بغیر سوزنی و مسند تکیہ سادہ طور پر نشست فرمائی اور جناب میرزا اوج خلف جناب میرزا دبیر مرحوم کی اعجاز بیانی کو دیر تک سماعت فرماتے رہے اور ختم محفل تک شریک رہے۔

یہ موقع میرزا اوج نے ایسا پایا جو اُنکے والد بزرگوار کو بھی حاصل نہ ہوا تھا اور جس سے زیادہ میرزا اوج کے لئے کوئی اوج نہیں ہو سکتا لیکن اس کے بعد جناب میر انیس کے خاندان میں کسی کو حضور والا کی سماعت کا فخر حاصل نہ ہوتا تو آپس میں ایک قسم کا چرچا کیا جاتا جس سے اس پارٹی کی دلشکنی متصور تھی لیکن اعلیحضرت نے

دوسری پارٹی کو بھی پورے طور سے اپنی عزت افزائی اور سخن شناسی کا موقع دیا اور حضور ممدوح بہ نفس نفیس نواب بہرام جنگ بہادر کے امام باڑہ میں تشریف لے گئے اور جناب رشید کی مرثیہ خوانی کو خوب دل لگا کر سنا - اور چونکہ خود اعلیٰ حضرت کو شاعری میں ملکۂ راسخہ حاصل ہے - اس لئے جا بجا جناب رشید کی سلاست و فصاحت کی داد دیتے رہے - حیدرآباد میں یہ پہلا موقع ہوکہ فرمانروائی ملک نے سبط شہید کی مجلس عزا میں شرکت کی ہو - نواب فیاض علی خاں بہادر اور نواب بہرام جنگ بہادر پہلے امیر سردار ہیں جن کو اس موقع پر اعلیحضرت کے خیر مقدم کا فخر حاصل ہوا -

اسی طرح جناب میرزا اوج اور جناب میرزا رشید پہلے مرثیہ خواں ہیں جنکی اعجاز بیانیوں نے حیدرآباد جیسے مقام میں یہ اثر پیدا کیا کہ اعلیحضرت نظام حیدرآباد کے دل میں انکی گنجائش پیدا ہوگئی اور وہ انکے سننے کو بہ نفس نفیس تشریف شریف لاکر شریک مجلس عزا ہوئے جس نے حسینؑ مظلوم کی روح کو بے انتہا خوش کیا ہوگا اور جسکا ذکر تمام ملک میں تحسین و آفریں سے کیا جاتا ہے اور کیا جائیگا خداوند عالم اعلیحضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ و اقبالہٗ کے عمر و اقبال میں ترقی فرمائے -

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

حضرت اوج کو اعلیحضرت نے پانچ کشتیاں آموں اور خربزوں کی بھیجی تھیں اس پر فی البدیہہ کو ایک رباعی تصنیف کر کے بطور شکریہ بارگاہ خسروی میں ارسال کی وہ رباعی یہ ہے -

رباعی

اوج کو اوج ملا پرورش آصف سے ۔۔۔ کشتی نور میں ہر خربزہ خورشید بنا
اشبۂ تازہ و تر دیکھ کے دل سینے میں ۔۔۔ بول اٹھا انبتک اللہ نباتاً حسنا

نقلیات

نقل شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے مشاعرہ میں یہ طرح ہوئی۔

روح القدس سے ہے نام مرے ہمصفیر کا

دونوں اُستادوں کی معرکۃ الآرا غزلیں اُن کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ ناسخ کی غزل کو زیادہ شہرت ہوئی اور یہ مطلع زبان زد خاص و عام ہوگیا ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیرؑ کا روح القدس سے ہے نام مرے ہمصفیر کا

میر صاحب کی ابتدائے مشق تھی۔ غزل کہنے سے طبیعت کو روک لیا گیا تھا اس لئے اسی زمین میں سلام کہا اور نواب شرف الدولہ بہادر کی مجلس میں پڑھا جہاں اس سے پہلے وہ مشاعرہ ہو چکا تھا۔ سننے والے ایک ایک مصرع کو لے اُڑے۔ اور جا بجا میر صاحب کے سلام کی دھوم ہوگئی۔ راقم نے سلام کے چند اشعار متن کتاب میں اور الحق جب ناسخ اور آتش کی غزلوں کے سامنے اس سلام کو دیکھا جائے تو میر صاحب کے کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر صاحب کے کئی مطلعوں میں سے ایک مطلع یہ ہے ؎

حافظ اگر ہو عدل جناب امیرؑ کا کرتے ہیں سے جسم میں شعلہ حریر کا

نقل۔ میر قربان علی سالک (شاگرد میرزا غالب) اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت لکھتے ہیں۔

میں دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں۔ دلی میں میرزا غالب اور اُستاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور میرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ ایک طرف کا معتقد دوسری

طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں
میں کافر۔ میں نے اپنے آپ کو میر انہیں کے طرف داروں
میں رکھا ہے۔ ایک روز میر صاحب سے دلّی کا ذکر آگیا۔ طرزِ بیان
سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تک اُن کے دل میں دلّی بسی ہوئی
ہے۔ اپنی جائے سکونت (سبزی منڈی) کو فرمانے لگے۔ یہ
اسی باغ کا سبزہ زار ہے۔ مرزا غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے
یاد کیا۔ اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر
اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر
پڑھا ؎

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی۔ جیسے کوئی حسین صورت
سامنے ہے اور ہوا سے اُس کی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب
اُس کو دیکھ دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک
روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ۔ میں نے میرزا غالب کی یہ
غزل پڑھی ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے	ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر	کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اُس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا	ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے یہ کہکر فرمانے لگے لکھنؤ والے رو کے ہے۔

کھینچے سے ہیں نہیں بولتے اور ڈبو یا کبھی اُن کی زبان پر نہیں مگر میں لکھ جاتا ہوں۔

نقل ۔ جناب عشق سے اور جناب میر صاحب سے قرابت قریبہ تھی۔ اتفاق سے کچھ بے لطفی ہو گئی اور طرفین کی بیگمات سنے اور بات بڑھا دی۔ ایک روز جناب عشق کا ذکر آیا جبکہ میر صاحب برافروختہ ہو رہے تھے لیکن اُس وقت میں بھی میر صاحب نے لطف بیان پر قابو رکھا۔ فرمایا کہ میں عشق کو خوب جانتا ہوں اُن کو پہلے ایک بات نکالنا پھر رونا دھونا خوب آتا ہے۔

عشق سے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اُس کی اک نئی ہی چال
کہیں آنسو کی یہ روایت ہے کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

میر صاحب نے یہ شعر اس موقع پر پڑھے گویا میر تقی میر نے اسی موقع کے لئے تصنیف کئے تھے۔

نقل ۔ میرزا دبیر کا ایک بے نقطہ مرثیہ مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا طاؤس کلک مدح اُڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلع مہر سما ہوا اور دو ورکلام سراسر ہرا ہوا

ہوگا عطار د اسم معرا ہمارا عام
کس کس کا اس طرح کا مسلم ہوا کلام

ایک صاحب نے میر انیس سے ذکر کیا کہ میرزا دبیر نے ایک مرثیہ لکھا ہے جس میں اول سے آخر تک کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا۔ میر صاحب مسکرا کر بولے یہ کہئے سر سے پانوں تک مہمل ہے۔ جو لوگ جانتے تھے کہ اس صنعت کو صنعت مہملہ کہتی ہیں وہ میر صاحب کے لطف بیان سے محظوظ ہوئے لیکن راقم نے جناب آغا محمد صاحب وکیل جوڈیشل لکھنؤ سے سُنا ہے کہ یہ مرثیہ میرزا دبیر کا نہیں بلکہ آغا صاحب کے

خاندان میں کسی کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے جو اختر تخلص فرماتے تھے اور اختر کی رعایت سے اس مرثیہ
میں عطارد تخلص رکھا مجھ کو آغا صاحب کا بتلایا ہوا نام بھول گیا شاید مرزا مہدی نام بتایا تھا

نقل میر انیس اپنے فرزند میر خورشید علی صاحب نفیس سے کچھ ناراض ہو گئے تھے
اور وہ ناراضی اس درجہ پہنچ گئی تھی جس سے دونوں میں سخت کبیدگی تھی اور میر نفیس
کی دوسری والدہ اُن کی طرف سے میر انیس کو بھڑکاتی رہتی تھیں اس لئے میر صاحب
کو میر نفیس کی طرف سے بالکل بے پروائی تھی۔ ایک روز ایک صاحب نے
باپ بیٹوں میں صلح کرانے کے لئے یہ تمہید پیدا کی کہ میر نفیس کا ایک مرثیہ سن کر میر صاحب
سے ذکر کیا کہ ایک صاحب نے مرثیہ لکھا ہے جو بالکل آپ کے کلام سے ملتا جاتا
ہے۔ میر صاحب یہ سن کر چونک پڑے اور فرمایا میں اُس مرثیہ کو دیکھ سکتا ہوں۔ اُنہوں
نے کہا کل حاضر کروں گا۔ دوسرے روز وہ مرثیہ لے گئے۔ میر صاحب نے اول سے
آخر تک اُس کو تعجب سے دیکھا اور فرمایا کہ بیشک یہ میرے خاندان کی زبان میں
لکھا گیا ہے۔ اور ترکیب کلام بھی مجھ سے ملتی ہوئی ہے۔ شاید میر مونس کی تازہ تصنیف
ہے۔ اُن صاحب نے کہا نہیں۔ جب میر صاحب نے زیادہ اصرار سے پوچھا تو کہدیا
کہ یہ آپکے صاحبزادہ گرامی میر نفیس کی تصنیف ہے یہ سن کر میر صاحب نے وہ مرثیہ پھر ہاتھ
میں لے لیا۔ اور محبت پدری میں جوش میں فرمایا کہ میر نفیس کو بلاؤ۔ چنانچہ میر نفیس حاضر
ہوئے اور میر صاحب کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ میر صاحب نے گلے لگایا اور ہونہار
فرزند کے زورِ طبیعت کی داد دی اُسکے بعد میر نفیس کو اپنا صحیح جانشین بنا کر چھوڑا۔
میر نفیس کا درجۂ شاعری میر انیس سے کم نہیں۔

نقل۔ میر مونس میر نفیس میر انیس کے سامنے حاضر تھے۔ دوسرے خوش
فکروں میں سے ایک صاحب نے کہا کہ آپکے خاندان میں سب صاحبوں نے اپنے اپنے
مذاق کے موافق مرثیے لکھے ہیں اگر ایک مضمون پر ایک بحر میں تین مرثیے لکھے جائیں

تو بڑی دلچسپی سے دیکھے اور سُنے جائیں گے چنانچہ وہیں یہ بات طے ہو گئی کہ حضرت زینب کے بیٹوں کی جنگ کو مع تشبیب صبح کے ایک بحر میں لکھا جائے اور چند لوازم جمع کئے جائیں۔ اُس پہ میر نفیس نے یہ مرثیہ لکھا۔

جب عابدوں کو طاعت رب میں سحر ہوئی
تیاریٔ نمازِ جماعت ادھر ہوئی

اور میر مونس نے اس مرثیے میں اپنی طاقت شاعری صرف کی ؎

جب آسماں پہ مہر کا زریں نشاں کھُلا — پھولی شفق درِ چمنِ آسماں کھُلا
جھونکے چلے نسیم کے بابِ جناں کھلا — فوجِ حسینؑ میں علمِ زرفشاں کھلا
صف بستہ تھے حسینؑ کے پیارے زمین پر
ذرے تھے آسماں پہ ستارے زمین پر

اور میر انیس نے یہ مرثیہ لکھا ؎

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

ناظرین کو ان تینوں مرثیوں کے دیکھنے سے تینوں کے مدارج شاعری کا فرق اور میر صاحب کا درجہ امتیاز معلوم ہو سکتا ہے۔

نقل۔ میر انیس کو ایک امیر نے مدعو کیا۔ کھانے کے بعد آم آئے۔ چند احباب جمع تھے اُن میں ایک حکیم صاحب بھی تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا کیوں جناب حکیم صاحب آم کھانا کیسا؟ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آم کا مزاج حار ہے اور آج کل فصل بھی گرم ہے پانی کھل کر نہیں برسا اس لئے احتیاط مناسب ہے لیکن حکیم صاحب نے جب دیکھا کہ اچھے اچھے آم صرف کلام ہوئے جاتے ہیں تو چند آم چن چن کر ایک قاب میں علیحدہ رکھ لئے تاکہ پوری دل جمعی سے سیر ہو کر کھائیں۔ اُن صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب ہمیں تو آپ منع کرتے ہیں اور اپنے لئے یہ سامان۔ حکیم صاحب بولنے نہ پائے تھے

کہ میر انیس نے فرمایا فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔

نقل میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے قدر شناس رئیس نے منجملہ اور لوازم ضیافت کے ایک من برف کی سل بھیجی۔ میر صاحب کے رفیقوں میں ایک میر صاحب تھے انہوں نے گڑھا کھدوا کر اُس میں رکھ دی تاکہ بقدر ضرورت نکالتے رہیں شام کو وہ رئیس تشریف لائے اور برف کا ذکر آگیا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ آپ نے حاتم کا کام کیا تھا مگر میر صاحب نے قارون کی طرح زمین میں دفن کیا تاکہ وہ چاندی کا ڈلا پانی ہو کر نہ بہہ جائے۔

نقل۔ راقم حیدرآباد کو جارہا تھا منمار کے اسٹیشن سے اُس گاڑی میں سوار ہوا جس میں میر انیس کے بھائی اور میر وحید کے باپ جناب میر انس تشریف رکھتے تھے۔ پھر حیدرآباد پہنچکر جناب موصوف شمس العلما ر مولانا سید حسین صاحب بلگرامی کے ہاں فروکش ہوئے میں بھی کئی مرتبہ زیارت کو حاضر ہوا۔ ایک روز میں نے عرض کی۔ کیوں قبلہ جناب غفراں مآب (میر انیس مرحوم) کا کلام اس کے علاوہ اور بھی ہے جو چھپ کر شائع ہوا یا عام طور سے شائقین کے ہاتھوں میں پہنچا۔ یہ سُن کر فرمانے لگے۔ اس کو کیا پوچھتے ہو سیکڑوں مرثیے اور سلام شائع ہونے سے باقی رہ گئے اُن میں کتنے مرثیے خود میر صاحب نے کہیں نہیں پڑھے وہ اخیر وقت کے لئے رکھے تھے کہ جب پیرانہ سالی میں ضعف ہوگا تو زور جوانی دکھایا جائے گا میں نے پوچھا پھر وہ کیا ہوئے کس کے پاس پہنچے تو ایک پرحسرت لہجہ میں فرمانے لگے اس کا حال نہ پوچھئے ؎

ہر کس از دست غیر نالہ کند

سعدی از دست خویشتن فریاد

لیکن اس معمے کی کچھ تفصیل نہ فرمائی ہاں طرز کلام سے معلوم ہوا کہ گھر کے گھر ہی میں ایسا ہوا ہر قطع نظر اسکے مجکو اُس وقت میں ان باتوں کی تفتیش کبھی نہ تھی اب جو لکھنؤ گیا اور اُن کا پتا لگانا چاہا تو کسی غیر مشتہر کلام کا کچھ پتا نہ ملا۔ با ایں ہمہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے

کہ اب تک میر صاحب کا تمام کلام اُن کے خاندان میں محفوظ ہے۔ گو اُس کی چھپانے یا اُس میں دوسرا جوڑ لگانے کی کوشش کی جاتی ہو۔ البتہ آیندہ اُس کے تلف ہو جانے یا دوسرے کلاموں میں مل جانے کا سخت اندیشہ ہے۔

میر انیس اور سرقہ

اُردو میں میر انیس کا درجہ کسی طرح فارسی میں فردوسی طوسی کے درجہ سے کم نہیں بلکہ چار باب میں بڑھا ہوا ہے۔

(۱) فردوسی نے بادشاہوں اور شاہنشاہوں کے مختلف معرکہ ہائے جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے میر انیس نے ایک غریب مظلوم کی لڑائی کی تصویریں کھینچی ہیں۔

(۲) فردوسی نے غم کی تصویر نہیں کھینچی۔ میر صاحب نے غم و درد کی وہ تصویر کھینچی جس سے ہر آنکھ خونابہ فشاں نظر آتی ہے۔

(۳) فردوسی کو ادب کی دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ میر صاحب نے اس وادی میں وہ کام کیا جس سے اُردو ادب آموز ہو گئی۔

(۴) فردوسی کو اصلاح زبان کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میر صاحب کو قدم قدم پہ زبان کی اصلاح و درستی سے کام لینا پڑا۔

فردوسی کی تصنیف سے میر صاحب کی تصنیف زیادہ ہے۔ ایسے شخص کی نسبت کسی شخص کا چند شعر پیش کر کے یہ کہہ دینا کہ ان شعروں کا مضمون فارسی شعروں سے ملتا ہے اس لئے یہ سرقہ ہے کہنے والے کے لئے چھوٹا مُنہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ اس بات کی تنقید کے لئے اُردو کی پچھلی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ اُردو کے زبان آوروں میں سودا۔ میر۔ مصحفی۔ انشا۔ ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ مومن نے تو میدان تغزل میں ایک قسم کا کام کیا۔ بعض الفاظ ایک وقت میں سرمایۂ ناز سخن تھے دوسرے زمانہ میں متروک

ہو گئے لیکن میرزا غالب اور میر انیس نے اُردو کے میدان ادب کو ہموار کر کے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں پیدا کیں۔ اس لئے لازمی طور سے اُن کو بعض مقام پر فارسی مطالب کو اپنی زبان میں لانے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک زبان کے خیال دوسری زبان کے مقال میں جانا سرقہ نہیں ہوسکتا۔ اور کہنے کو تو جو لکھا جائے وہ انشار وادب میں شمار ہوگا۔ لیکن فی الحقیقت ادب کا مفہوم حسن وعشق کے امتیازی مطالب اور امیروں اور بادشاہوں کے درباری مقاصد کو ادا کئے بغیر پورا نہیں ہوتا اس لئے اردو میں ادبیات کا حصہ میر انیس کے کلام سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے بعد غزل کہنے والوں کی باری آئیگی کیونکہ اُن کو درباری ادب سے بہت نفور التعلق رہا ہے بلکہ جو لوگ معرفت آشنائے تصوف نہیں۔ انکی شاعری منشار ادب سے باہر نکلے گی۔ مجھکو تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے ادیب نے جو دو زبانوں کی آمد وآورد اور ہر ایک کے معانی ومبانی سے واقف ہیں کسی ایک کم مایہ چھچھورے کے طرز عمل کی کیوں تقلید کی۔ جو چند شعروں کے لئے "سرقات" کی نام سے ایک علیحدہ فصل قائم کر دی جس کا نتیجہ کچھ نہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں حیدرآباد میں جناب مولوی سید علی حسن خان صاحب سابق ناظم بندوبست ممالک محروسہ سرکار نظام حال ریوی نیو ممبر کونسل ریاست اندور کے بنگلہ پر شریک جلسہ تھا اُس میں خدا بخشے ملا محمد عبدالقیوم صاحب مرحوم تعلقہ دار اول کے بھائی مولوی محمد عبدالحی صاحب مددگار بندوبست تشریف لائے اور شعر و سخن کا ذکر نکلا سب صاحب متوجہ ہو بیٹھے۔ جب اپنی اپنی باری ہو چکی تو دوسرے اساتذہ کا تمیز آیا۔ میں نے میر انیس کا یہ مطلع پڑھا ؎

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے ‏ ‏ شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

کیسا لاثانی مطلع ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب نے یہ مطلع سنکر اُسی مضمون کا ایک

فارسی شعر پڑھا اور آخر کو خود فرمایا کہ میر صاحب کو توارد ہوا ہے یا جان بوجھ کر اُسی مضمون کو اپنی زبان میں ادا کر دیا ہے اور دکھایا ہے کہ جو مضمون فارسی میں بسیا ختگی سے ادا ہوا اُسکو اُردو میں یوں ادا کرتے ہیں پس میرے نزدیک ایسے مقامات پر یہی رائے دی جا سکتی ہے چنانچہ مولانا شبلی کے رسائل اور مقولات میں جو مقامات عربی سے اخذ کئے گئے اور عربی سے لائے گئے ہیں جیسے رسالہ الندوہ میں سلسلہ تولید والا مضمون علامہ اندلسی کی کتاب سائنس اور اسلام کے مضمون سے ملتا ہوا ہے ضروریات ادب کے تحت میں دیکھے جا سکتے ہیں یا ہماری قوم کے اعلیٰ گریجوایٹ جن کو علم و ادب سے سروکار ہے شیکسپیر ملٹن وغیرہ کے خیالات کا چربہ اپنی زبان میں آتارتے اور مغربی خیالات کو مشرقی مقالات میں ادا کرتے ہیں جیسے کسی نے انگریزی میں ایک نیچرل نظم دیکھی اور اُردو میں اُس رنگ کی نظم تیار کی تو وہ ہرگز داخل سرقہ نہیں ہو سکتی۔ ایسے مواقع کے لئے متکلم کا درجہ اور اُس کی نیت اور منشار کا دریافت کرنا ضرور ہے۔ اور علامہ شبلی نعمانی نے بھی اسی اصول کو مدنظر رکھ کر نساخ کی ژاژ خائی کا خاتمہ کر دیا ہے۔

میر انیس کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ اور فصیحانہ بندش

چاندی سونا ہر جگہ پایا جاتا ہے لیکن ایک معمولی سنار اور سادہ کار جڑیئے کا فرق علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ہی الفاظ بھی ہیں جو عام طور سے بولے جاتے ہیں لیکن ہر لفظ کا اپنے موقع پر سے چسپاں ہونا ایسا ہے جیسے ایک انگوٹھی پر سادہ کار جڑیئے نے ہیرے کے نگ جڑ دیئے ہوں۔ میر انیس معمولی لفظوں کو جس خوبصورتی سے کھپاتے ہیں وہ اُن کا حصہ ہے۔ اکثر مقام پر اُنکی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ سہوتے

میں سہاگے کا کام دیجاتے ہیں یہاں یکے از ہزارہ اند کے از بسیار چند مصرعے اور اشعار نقل کرتا ہوں
انقلاب زمانہ کا ذکر کرکے فرماتے ہیں ع جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے
زمانہ کی شکایت کرکے کہتے ہیں ع مولا یہ کلیجے سے پھپولوں کی دوا تھی ؛
سوار ہوتے وقت امام حسینؑ کی تصور حال لکھتے ہیں ع گردان کے دامن علی اکبر کو پکارے ؛
تلوار کے متعلق کہتے ہیں ع ناہیں نہیں غصہ سے اجل چھپ گیا جیبں سے ؛
ع جوہر تھے کہ پہنے تھی دامن پھولوں کا گہنا ؛ ع دو زخم کی زبانوں سے بھی آنچ اسکی بری تھی
ع قلزم کا بھی دہارا ہو تو پانی کو نہ پہنچے ؛ ع قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے
ع تلواریں اگر کھینچتی ہیں ہاں ہونٹوں پہ دم ہے ؛ ع پی پی کے لہو اور بھی دم بڑھ گیا اُس کا
ع منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی ؛
امام حسینؑ کی جنگ کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع پھیلائی تھے دامن کو پھریری کی طرح دو
امام حسینؑ گھوڑے سے فرماتے ہیں ع بہتر ہے کہ اتروں نہیں تیورا کے گرونگا
امام حسینؑ کی حالت ضعف کو بیان کرتے ہیں ع خود ٹیک کے تلوار کو سنبھلے شہ عالی
غش کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع جھک جاتی تھے ہر نیزہ پہ جو غش میں شہ ابرار
حضرت زینب گھوڑے کو بے سوار دیکھکر کہتی ہیں ع گھوڑا تو ہے کوتل کدھر اتری ہے سواری
میر انیس اپنے حاسدین کی نسبت کہتے ہیں ع بے تیغ کٹے جاتے ہیں شمشیر زباں سے
امام علیہ السلام کی رحلت کے وقت کا بیان کرتے ہیں ع بہنیں پچھاڑیں کھاتی تھیں خاک پہ کرکے
بین ؛ مدینہ سے کوچ کرتے وقت سواری کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ؎

ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لئے فراش کھڑے ہیں

صغرا علی اکبر سے کہتی ہیں۔ ع حقدار ہوں میں بیاہ کا میں بھی رہے دھیان
زنانی سواریوں کے متعلق فرماتے ہیں ؎

باہر حرم آتے ہیں رسولِ دوسرا کے ۴ — شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

مدینہ سے سواری نکلنے کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع

تھا نانا کے تک شہر کے اک شورِ قیامت

جب شہادت مسلم کی خبر آئی اُس وقت کی حالت بیان کرتے ہیں ۵

کرتی تھی بیاں زوجۂ مسلم یہی پیہم — کیا ہے کہ رندھی جاتی ہوں گھٹتا ہے مرا دم

کربلا میں بچوں کی حالت بیان فرماتے ہیں ع خورشید سے منہ گرد بیتیمی سے آتے ہیں

لڑائی کے وقت بچوں کی کیفیت کا بیان ہے ع بچے کبھی باہر ہول کے تر ہیں پسینے میں

لڑائی کے وقت دریائے فرات کی موجوں کا حال بیان کرتے ہیں ع

لہریں یہ ہیں کہ چلتی ہیں تلواریں فوج میں

شامیوں کی نسبت لکھتے ہیں ع ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

باجوں کی نسبت لکھتے ہیں ع باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

فرزندان زینب کی تصویر کھینچتے ہیں ع خط اک طرف حسین بھی کسی کے عیاں نہیں

کربلا کی نسبت کہتے ہیں ع روئے زمیں پہ ہے یہ ٹکڑا بہشت کا

کوفہ میں ایک ظالم کی ماں نے فرزندان مسلم کو چھپا رکھا تھا جب وہ آیا اور پوشیدہ تجسس کرنے لگا تو وہ اصل بات کو چھپانے کے لئے باتیں بنانے لگی اس موقع پر کہتے ہیں ع

پاس آکے ضعیفہ نے بہت باتوں میں گھولا

تلوار چلنے کے وقت کا حال لکھتے ہیں ع تھی مینہ کی طرح خاک پہ بوچھاڑ سروں کی

تیروں کی نسبت فرماتے ہیں ع بوچھاڑ تھی تیروں کی ساون کی جھڑی تھی

پیاسے گھوڑوں کی نسبت فرماتے ہیں۔ ع تو نیسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہوئے

کربلا کے واقعات نے عزیز و انصار پر جو اثر کیا اُس کی نسبت لکھتے ہیں ع

دل رُندھ گئے تھے چاند سے چہرے اُداس تھے

گھوڑوں کی نسبت فرماتے ہیں ع راتوں میں کوندتے ہوئے بجلی سے راہوار

حُر کی حالت لکھتے ہیں ع گھوڑے پہ ڈگمگانے لگا حُر نامدار

امام حسینؑ کی رخصت کے وقت کا حال بیان فرماتے ہیں

ع در پہ بلکتی رہ گئی زینب جگر کباب

فرزندانِ مسلم کے حال میں لکھتے ہیں ع اب چھاتیوں کو توڑتی ہیں آ ہونکی بھالیں

متفرق مصرعے اور اشعار ملاحظہ ہوں ع چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے تلوار

ع باگیں جو اٹھائیں تو فرس بن گئے آہو

برباد کیا ردمیں سواروں کو دبا کے رہوار کبھی اسوار تھے گھوڑوں پہ ہوا کے

ع تھیں کہنیاں پہونچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے ع آدھے ہوئے جاتے تھے بعین جان کے ڈر سے

ع دریا کے تھپیڑے تھے طمانچے تھے قضا کے ع دم بھی تو مرجاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے

ع ایسا تو کوئی تیند کے ماتے نہیں ہوتا

حضرت زینب بچوں کی بیچوں کی نسبت فرماتی ہیں ع اللہ انہیں چھوٹی سی تلوار و نہیں جب دے

ع دولہا کا پسینہ ہے کہ ہے عطر دلہن کا

ع بجلی سی لگی کوندنے ڈھالوں کی گھٹا میں

ع نیزے کو جو دیکھا تو نہ پوری تھی نہ ساں تھی ع جھنکار چلے کے رن میں صفت دیو پکارا

قاسم وارزق کی نیزہ بازی ع تھی زد جو کڑی ٹوٹ گئیں ڈانڈیں بھی لڑ کر

حضرت قاسم ع تیورا کے جھکے تھے کہ پڑی تیغ کمر پہ

حضرت عباس کی تلوار ع ناب اس کی نہ تھی مانگ نکالی تھی پری نے

ع ہلتا تھا کلس خیمہ کا ہر ہر کی صدا سے ع بپھرا اسپ شبیر الٰہی غضب آیا

ع رہوار کو جھلا کے کبھی کاوہ پہ ڈالا

روضہ کی نسبت لکھتے ہیں ع کیا بیں نہیں اس در پہ ستارے سے جڑے ہیں

ع گچ واں کی بنائی ہے ستاروں کو ملا کر ع جو اُس کا شبکہ ہے وہ اک چشم پری ہے
حضرت عباسؓ کے گھوڑے کی نسبت ع اندھیارہی نہ تھی چہرے پہ گھونگٹ تھا ارن کا
خیمہ کے لڑکے ع تکتے تھے سوئے نہر سراچوں کے تلے سے
حضرت عباسؓ فرماتے ہیں ع آفاق میں مجھ سا کوئی ساونت نہیں ہے
ع گردوں سے مری تیغ کا لنگر نہیں اٹھتا
حضرت عباس کے مقابل ع لچکاتے ہوئے ڈانڈ بڑھے برچھیوں والے
خیمہ کی نسبت ع آئینہ اسے نور تھے ٹھپے قنات کے
غرض کہاں تک انتخاب کیا جائے اور کس کس بات کی داد دی جائے ؎

زپائے تا بہ سرش ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

میرزا دبیر کا رنگ

بعض مقامات پر جہاں میر صاحب کی شوکت کلام آورد کے پنجے میں پھنس گئی ہے میر صاحب کے کلام میں بھی میرزا دبیر کا رنگ آگیا ہے جیسے فرماتے ہیں ؎

هم نور ہیں گھر طور تجلی ہے ہمارا   تختِ بن داؤد مصلا ہے ہمارا
شبدیز نے چھل بل میں عجب ناز دکھایا   فتراک سے تا اوج پہ پرواز دکھایا
طے کر کے سپہری کونسا قصہ تھا فرس کا   باقی تھا جو کچھ کاٹ وہ حصہ تھا فرس کا
چلنے لگی یکدست جو شمشیر دو دستی   معلوم ہوا لُٹ گئی سب کفر کی بستی

تلوار نکلنے کی صورت کھینچتے ہیں ؎

عنقائے ظفر فتح کا در کھول کے نکلا   شہباز اجل صید کو پر تول کے نکلا

امام حسینؑ کی قلت اور مخالفین کی کثرت فوج پر ریویو کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اُس فوج میں فوج قطب اوج امامت — آئی نظر نقطہ پرکار کی صورت

خیمہ امام علیہ السلام کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گیسوئے حور خلد کے ہمسر ہر اک طناب — دریا تھا وہ تو گنبد گرداب ہر اک طناب

حضرت عباس کے نعرہ جنگ پر لکھتے ہیں ؎

نعرہ جو کیا شیر نے یا حیدر کرار — اڈتا دار اضی عرب ہل گئے اکبار

میدان کربلا کی حالت بیان کرتے ہیں ؎

اٹھتے تھے تتق گرد کے میدان بلا میں — چنگاریاں اڑتی تھیں سناٹوں سے ہوا میں

پرانی ترکیبیں اور پرانے الفاظ

میر صاحب آج کے شاعر نہیں میر صاحب کی شاعری کا زمانہ ناسخ و آتش کے وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ کتنے لفظ اور کتنی ترکیبیں زمانہ میر و سودا کی باقی تھیں اسلئے بعض الفاظ میر صاحب کے کلام میں بھی اسوقت کے یادگار نظر آجاتے ہیں جو قابل گرفت نہیں۔ ہر زبان میں یہ تغیر جاری رہتا ہے کہ کل جو الفاظ بولے جاتے تھے آج نہیں بولے جاتے۔ یا پہلے کی ادائے سخن اور تھی اور اب اور ہوگئی جیسے میر صاحب کے کلام میں بعض جگہ دیجو۔ دیجیو۔ کیجو۔ کیجیو۔ پیجو۔ پیجیو۔ لیجو۔ لیجیو مستعمل ہیں۔ اور جدید اصول اشتقاق مصدری کے موافق دینا۔ کرنا۔ پینا۔ لینا۔ صحیح قرار دیتا ہے۔ یالیویں گے۔ دیویں گے کی جگہ لیں گے دیں گے صحیح قرار دیا جاتا ہے یا مرد کی طرف سے میری جانی کی جگہ میری لڑکی بولتے ہیں

ع چہرے کی سجائی سے قبا چست ہے تن کی پر اب سجائی کی جگہ سجاوٹ کہتے ہیں۔

یا میر صاحب کے کلام میں گود اور گودی دونوں آغوش کے معنی میں آئے ہیں

لیکن جدید اصول یائے تحتانی کو زائد قرار دیتا ہے ع لو جانے دو غصہ کو مری گود میں آؤ

ع گودی میں گئی باپ کے گھبرا کر وہ بی آس

میر صاحب فرماتے ہیں ع در پہ بلکتی رہ گئی زینبؓ جگر کباب ۔ اب بلک کر رونا مخصوص بچہ کے لئے بولا جاتا ہے ۔ میر صاحب نے کمر کے لفظ سے کہیں میم کو ساقط کر دیا ہے جیسے

ع کمروں کو کسو گلشن جنت کے سفر پہ

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں ع باندھیں کمریں شہ کے عزیز و رفقا نے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرعہ پہلے کا یادگار ہے میر صاحب کا مصرع ہے

ع یہ روتی ہیں جوں جوں انہیں سمجھاتی ہیں بھیا

اب بھیا کو خلاف فصاحت جانکر بھائی بولتے ہیں ۔ ہاں بعض عورتیں بھائی کو بھیا کہہ کر پکارتی ہیں یا بعض گھروں میں ایک بھائی دوسرے کو بھیا کہکر پکارتا ہے لیکن فصاحت پسند نہیں کرتی ایک بند میں لکھتے ہیں ؎

کانپی زمیں ہل گیا صدمہ سے چرخ پیر
نکلی لحد سے فاطمہؓ جیب کفن کو چیر

اب یہ ترکیب "جیب کفن کو چیر" داخل فصاحت نہیں رہی ایک مقام پر اٹھارہ بنی فاطمہ کی نسبت فرماتے ہیں ؎

اک رشتہ میں جاگہہ انہیں بخشی تھی خدا نے ۔ اب جاگہہ کا لفظ متروک ہے

ایک بند میں لکھتے ہیں ؎

گہہ چھپا اور گہے نکلا وہ مہ اوج شرف
گہے اس صف میں در آیا گہے رو ندی وہ صف

گہے دریا کے کنارے گہے صحرا کی طرف
گہے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہ نجف

قدما میں ایک لفظ کی ایسی تکرار کو پسند کیا جاتا تھا ۔ اب انداز فصاحت سے بیگانہ سمجھا جاتا ہے

ایک مقام پر حر کی نسبت امام حسینؑ کا قول نقل فرماتے ہیں ؎

شاہ چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم
ماں ہر یاں اسکی نہ خواہر یہ تمہیں ہے معلوم

ہم بھی مظلوم ہیں مہماں بھی ہے اپنا مظلوم　　　کون لاشے پہ کرے نالہ و فریاد کی دھوم

یہ ترکیب پہلے کی ہے اب لاش پر نالہ و فریاد کی دھوم نہیں بولتے شیون وغیرہ بولتے ہیں۔ ایک جگہ امام حسنؑ کے جنازہ کی نسبت لکھتے ہیں ع ہفتاد تیر نکلے تھے تابوت شاہ سے لیکن اب اس طور پر ہفتاد کا لفظ کھٹکتا ہے۔ ان سب باتوں کو پچھلے زمانہ کا تبرک سمجھنا چاہیے۔

عربی لفظوں کی تضمین اور فارسی لفظوں کی ترکیب

میر صاحب نے عربی کے الفاظ جس خوبصورتی سے اردو میں کھپائے اور فارسی کے لفظ جس خوشنمائی سے اپنی جگہ پر بٹھائے ہیں وہ زیورات پر الماس و یاقوت کے نگینے معلوم ہوتے ہیں عربی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ حر جب زخمی ہو کر گرا تو ان لفظوں میں امام حسینؑ کو پکارتا ہے ؎

اے مددگار معین الضعفا ادرکنی　　　اے خداوند جہاں خذ بیدی خذ بیدی

امام علیہ السلام حرؑ سے کہتے ہیں کہ تو معصیت گزشتہ کا خوف نہ کر۔

ع غافر و راحم و تواب ہے رب عادل ؛ دوسرے مقام پر حرؑ کے پکارنے پر لکھتے ہیں ؎ حر پکارا بابی انت و امی یا دشاہ۔

حضرت عباس عزیز و انصار سے کہتے ہیں ؎

کرتے ہو مصیبت میں جو تم سب مدد شاہ　　　بس حق رفاقت ہے یہی اجرکم اللہ

فرزندان زینب میں سے بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے کہتا ہے۔

ع کیا خوب لڑے سلمک اللہ برادر

اب فارسی کی ترکیبیں ملاحظہ ہوں۔ فرزندان زینب کے سراپا کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

ان گیسوں میں نکہت مشک تتری ہے — سنبل کو بھی گلزار میں شوریدہ سری ہے

ع پلکیں کہیں سر تیزی میں نشتر سے زیادہ۔

حضرت قاسم مخالفین کی نسبت کہتے ہیں ع کیا سمجھیں جو وہ مست مئے بیخبری ہیں

ملبوس قاسم کی نسبت ع تکمہ تو ستارہ ہے گریباں مہ نو ہے۔

رجز میں حضرت قاسم کہتے ہیں ع چھیدوں دل ارجن جو کروں تیر کو پرتاب

ابرو کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

اک بیت کے یہ مصرع برجستہ ہیں دونوں — ظاہر میں کشیدہ ہیں پہ دل بستہ ہیں دونوں

حضرت زینب حضرت عباس سے کہتی ہیں ع منصف ہو تمہیں بھائی مری حق بطرف ہے

امام علیہ السلام کے لشکر کا حال لکھتے ہیں ع خشکیدہ زبانوں پہ سخن شکر کا جاری

حبیب ابن مظاہر کی تصویر کھینچتے ہیں ع انداز جوانوں کا کبھی پیرانہ سری بھی

امام حسینؑ کا مزار قریب مزار جناب سرور کائناتؐ بننے پر لکھتے ہیں ع منظور ہے کہ حق کو مکرر قرار ہو

مدینہ سے نکلنے کے وقت سواری کی تصویر لکھتے ہیں ع آراستہ ہیں بہر سفر سرو قبا پوش

حضرت صغرا کہتی ہیں ع واماندوں کے لینے کو کبھی آتا نہیں کوئی۔ ایک اور جگہ خون سفید

شدن ہونیکو لکھتے ہیں ع کیا ہو گیا ہے خون زمانہ کا سفید آہ۔ ایک جگہ اظہار فخر میں فرماتے

ہیں ع گردوں کا کھینچتا تھا فرق سے مغفر۔ تلوار کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

یوں تن سے سر گراتی تھی شمشیر آبدار — جیسے رگ سحاب کبھی ہو تگرگ بار

حضرت عباس کے گھوڑے کی نسبت فرماتے ہیں ع

رہوار پہ اسپند کیا کبک دری نے

تلوار کی نسبت ع کیا قبضہ سے اس برق جہاں سیر کی نکلے۔ اس طرح کی سینکڑوں

ہزاروں ترکیبیں ہیں کہاں تک لکھی جائیں۔ میر صاحب نے فارسی کی ہزاروں تشبیہوں اور استعاروں کو

اس خوبی سے اردو میں داخل کیا ہے جس کی اردو ہمیشہ احسانمند رہے گی۔

لکھنؤ میں میر انیس کا یادگار

یوں تو جب تک اُردو ہے میر انیس کا نام مٹنے والا نہیں۔ میر صاحب کا ہر مرثیہ اُن کا بہترین یادگار ہے لیکن عزیزوں - دوستوں ،شاگردوں اور قوم کے ایک ایک فرد پر واجب ہے کہ وہ سب باتفاق مجموعی دامے درمے قلمے قدمے اپنے اپنے فخر قوم کے یادگار کا سامان فراہم کریں جیسے آج کل یورپ میں ایک ایک نامور شخص کے لئے ہو رہا ہے حتیٰ کہ قدر شناس یورپ نے ایشیا اور افریقہ کے مُردوں کو زندہ کرنے کا سامان کیا ہے عمر خیام کے نام سے ایک کلب بنایا گیا ہے جہاں بڑے بڑے زندہ دل اور ایشیائی شاعری کا مذاق رکھنے والے لوگ جمع ہوتے ہیں اور مسلمانوں نے اکثر بزرگوں کے مزار یادگار چھوڑے ہیں اور لاکھوں روپیہ کے وقف و وظائف مطلبوں کے عطار مکارم کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی لکھنؤ میں آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک ایک امیر اور نواب اور انکی بیگمات نے کیسی لاثانی فیاضیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ایک ایک شخص کے یادگار خاندان اور یادگار پائدار کے لئے کیا کیا سامان کر گئے ہیں۔ پس میر انیس کے لئے اس شہر اور قوم کی طرف سے کچھ نہ ہونا شرم اور نہایت شرم کی بات ہے۔ خدا کے فضل سے اب بھی لکھنؤ میں جناب شاہزادہ سلیمان قدر بہادر و جناب نواب باقر علی خاں و نواب جعفر علیخاں صاحب دشیش محل ، و جناب میرزا محمد عباس صاحب و جناب ابو صاحب متولی حسین آباد اور اکثر نوابین و اہل وثایق ایسے موجود ہیں جن کی ادنیٰ توجہ سے میر صاحب کا اعلیٰ یادگار قایم ہو سکتا ہے جو آئیندہ نسلوں میں اس زمانہ کے فخر کا یادگار ہو فقط

تمت